مطبوعات نادیۃ الادب الاسلامی — (۸)

سواطع الالہام

نتیجہ فکر

سیدنا حضرۃ ابابشر مجۃ مدظلہ العالی

مکتبہ نادیہ

رجب المرجب سنہ ۱۳۷۴ھ • مارچ سنہ ۱۹۵۵ء

مطبع — صدیقی
طابع — قاری محمد اسمٰعیل
مہتمم — سیّد ابوذر بخاری
ناشر — مکتبہ نادیہ ۲۳۳ بی شیرخان
مقام —
تعداد — ایک ہزار ۱۰۰۰
ضخامت — ایک سو باون صفحات ۱۵۲

وجہ تسمیہ

سواطع الالہام!

☆ —— "سُطُوْع" — عربی زبان کی ایک مصدر ہے۔ جو صرفی طور پر باب فَتَحَ یَفْتَحُ سے متعلق ہے۔
اس لفظ کے چار یا پانچ معنی آتے ہیں، مثلاً:

- صبح کی روشنی کا پھیلنا۔
- غبار کا اڑ کر بلند ہو جانا۔
- بُو آنا۔
- بجلی چمکنا۔
- تالی بجانا۔

لیکن جو چیز قدر مشترک کے طور پر تمام معانی میں جزء اعظم کا درجہ رکھتی ہے وہ ہے "نمو"، ابھار، بلندی! اور لازماً انسانی خیالات و تصورات، جذبات کے غبار، واردات کی روشنی کے پھیلاؤ، احساسات کی برّاقیت، تاثرات کی حلاوت اور مہک، اور وجدان کے تاروں پر فکر و بصیرۃ کی زخمہ کاری سے پیدا ہونے والے بے صوت نغموں ہی کا نام ہے۔
پھر اگر جذبات و افکار عالم لاھوت کی تحریک و رہنمائی کا نتیجہ ہوں تو الہام کہلاتے ہیں، ورنہ محض ظنون —— ! اور عموماً انسانی اذکار و اقوال انہی دو صورتوں میں منقسم ہو کر بروئے کار آتے ہیں۔ چنانچہ اسی لغوی اور فکری اساس پر زیر نظر مجموعہ کو —— سواطع الالہام —— سے موسوم کیا گیا ہے یعنی "الہامی طور پر ابھرنے والے افکار —— !" یہ مجموعہ بھی حسب کتسمیہ نعت و منقبت اور دیگر اصناف سخن سے مرکب کلام پر مشتمل ہے۔ لہٰذا کلام کی دونوں حیثیتوں کا علمبردار ہونے کی وجہ سے مذکور الصدر نام کا صحیح مصداق و محل ہے۔

☆ ہندوستان میں دربار اکبری کے مشہور ادیب و شاعر علامہ فیضی فیاضی (مولود ۹۵۴ھ متوفی ۱۰۰۲ھ) نے کسی بھی تقریب سے سمجھئے، یا ادبی درجہ پر خدمت علم و ادب کے نقطہ نظر سے ہی سہی بہرحال — قرآن کریم کی ایک مکمل تفسیر صنعت اہمال میں لکھی تھی جس میں — بسم اللہ سے لے کر والناس تک ایک لفظ بھی نقطہ دار نہیں ہے۔ اور یہ التزام یقیناً علم انشاء میں رسوخ و کمال کا عظیم الشان اور محیّر العقول کارنامہ ہے جس پر ایک دنیا داد دے چکی۔ اب تحسین کرتی ہے اور آئندہ بھی اس کی مداح رہے گی۔ مصنف نے اپنے اس فنی شاہکار کے عنوان میں بھی اسی ضابطہ کا التزام کرتے ہوئے اس کا نام رکھا "سواطع الالہام" —— ! جو بے نقط تفسیر کا غیر منقوط نام ہے۔ زیر نظر مجموعہ کا نام اس علمی اور تاریخی کارنامہ سے بھی بطور یادگار مستعار لیا گیا ہے۔ جو اگرچہ انسانی کلام کی حیثیت میں کوتاہیوں سے مبرّا اور منزّہ تو نہیں — کہ بے عیب و معصوم تو بس خدا اور رسول کی ذات ہے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وبارک وسلم! تاہم —— صدیوں سے پامال شدہ فن شعر و سخن طرازی میں غلامانہ ذہنیت، خوشامد، خود غرضی اور کذب و افتراء کے جو مہلک جراثیم سرایت کر چکے ہیں اور ان کے نتیجہ میں ملت ظاہری اور باطنی بیماریوں کا شکار ہو کر رہ گئی ہے، علیٰ وجہ البصیرۃ اور علیٰ رؤس الاشہاد —— یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ زیر نظر مجموعہ کلام بھی ان جراثیم کے تعفن اور امراض کے عیب سے پاک ہے۔ لہٰذا اس حیثیت سے بھی یہ نام مجموعہ کے عین حسب حال اور مضامین کے مطابق ہے۔ بلکہ ان کے قلع قمع نیز صالح و بصیرۃ افروز اور حیات آمیز و انقلاب انگیز فکری عناصر کی قیادۃ و علمبرداری کا حامل ہے۔ دکھنی بہ فخراً ولا فخراً! بہرحال مجموعہ کی وجہ تسمیہ میں فنی اور تاریخی لحاظ سے جو امور مد نظر تھے انہیں حضرۃ امیر شریعۃ مدظلہ کی تصویب و تائید کے بعد عوام اور قارئین کے افادہ کے لئے درج کر دیا گیا ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم وھو یقول الحق ویھدی السبیل —— !

راقم السطور، خادم علم و ادب :- ابو ذر غفی اللہ عنہ واصلح احوالہ۔ امین!

تعارف!

أعوذ بالله من الشيطن الرجيم • بسم الله الرحمن الرحيم • الحمد لله! وله الخلق و الامر وحده • والصلوة والسلام على محمد الذى بعث ليتمم مكارم الاخلاق ولا نبى بعده • وعلى اله وصحبه وازواجه واتباعه الذين اوفوا عهده •

اما بعد

ا ـــ مناقب، سوانح اور تاریخ وسیرۃ کی اکثر کتب میں متعدد بزرگوں کے متعلق مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے لکھنے والوں نے، کچھ اس قسم کے فقرات وکلمات لکھے ہیں کہ ـــ فلان نشأ فی بیت علم وشعر وادب وحکمۃ، کان فصیحا بلیغا خطیبا مصقعا سخیا جوادا، شہما شجاعا، عابدا زاہدا، فقیہا عارفا، وما سوی ذالک!

اپنا خیال یہ ہے کہ اس عبارۃ میں اگر کچھ پیوند اور لگا دئے جائیں اور یاں صورۃ کہ :-

نشأ فی بیت مجد وشرف وکرم ونجابۃ، وغذی بلبان علم وادب وشعر وحکمۃ وفقاہۃ ومعرفۃ ـــ کان لبیبا فطینا، شہما ذکیا، فصیحا بلیغا، حافظا قاریا، خطیبا مصقعا، سخیا جوادا، عابدا زاہدا، امینا عفیفا، بطلا شجاعا، عمیدا زعیما، فارسا مغوارا، فلحا منظما وسیدا ومسودا •

کہ فلاں ممدوح نے شرافۃ اور بزرگی اور خالص حسب ونسب والے گھرانے میں ہوش کی آنکھ کھولی، علم وادب شعر وحکمۃ اور فہم ومعرفۃ کی غذا سے اس کی پرورش ہوئی، وہ عقیل وہوشمند، بلند فطرۃ اور ذکی الحس، فصیح وبلیغ، حافظ وقاری،

خطیب و زباں آور، سخی و صاحب جود و عطا، عابد و زاہد، امانت دار و پاکدامن، بیباک و بہادر، معتمد و رہنما، شہسوار و یلغار افگن، فاتح و مدبّر، اور سید و سردار تھا) ــــ!

تو اس مسلسل مگر مختصر وصف آرائی سے آئندہ سطور میں مذکور ہونے والی ہستی کے لوازم و خصائص کا ایک ہیولیٰ اور خاکہ طیار ہو جائے گا، پھر بات بھی سمجھنے اور ماننے کی ہے کہ :۔

۱ــ جس ذات کو پورے چودہ سو سال کے دیر مدید اور طویل عرصہ میں صرف چھتّیس پشتوں کی وساطت سے سید وُلدِ آدم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبی قرابت اور حسبی وراثت کا تعلق میسّر ہو! کہ جنکا نام نامی خود نجابت و کرم اور مجد و شرافت کے لیئے سند ہے تو اس کی شرافت و نجابت میں کوئی کلام ہو سکتا ہے؟

۲ــ جس ذات کو اب و اُمّ کیطرف سے باب مدینۃ العلم مولیٰ اُمّہ سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ ــــ کی سخن فہمی و نکتہ سنجی فطرۃً ودیعت کی گئی ہو، تعلیم دین اور تہذیب و اخلاق جس کی گھٹی میں پڑے ہوں ــــ اور جس کی طبعی نفاست اور ذوق انتخاب کو حسب دستور اہل نظر دنیا میں صرف کبوتر کا حُسن و معصومیّت، باز کی جرأۃ و قناعت، گھوڑے کی وفاء و شرافت اور شیر کی حمیّت و شجاعت راس آئی ہو اُسکی بلند دماغی، علم پروری اور ادب نوازی میں کسی کو شک ہو سکتا ہے۔؟

۳ــ جس ذات کے فکر عالی اور نگاہِ بصیرۃ کا سکون اور جس کے دِل و جان کی راحۃ انسانی اخلاق کے حسب ذیل عناصر اربعہ میں منحصر ہو جائے ــــ

یعنی بمصداق قولِ حسن مجسّم صلی اللہ علیہ وسلم ــ

اِلْتَمِسُوا الْخَیْرَ فِی حِسَانِ الْوُجُوْہِ ــ (الحدیث) اچھے چہروں میں بھلائی کی جُستجو کرو۔

اوّلاً ــــ اُسے حُسن صورۃ مرغوب ہو! ــــ

اور بمقتضی بکلام خُلقِ مجسّم صلی اللہ علیہ وسلم ــــ

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ (ترمذی)

میں اسلئے بھیجا گیا ہوں۔ کہ باعزۃ عادات و خصائل کی تکمیل کردوں ۔!

ثانیاً ۔۔۔ اُسے جمالِ خلق محبوب ہو !۔

اور بمفہوم ارشادِ اَنفسُ الکائنات، رَیحانۃ الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ۔

حُبِّبَ اِلَیَّ الثَّلٰثُ (وَمِنْهَا) الطِّیبُ (بخاری)

میرے دل میں تین چیزوں کی محبۃ ڈال دی گئی ہے اور انہیں میں سے ایک خوشبو ہے

ثالثاً ۔۔۔ اُسے شمیمِ جانفزا مطلوب ہو !۔

اور بمطابقۃ فرمانِ اَعدلُ النّاس صلی اللہ علیہ وسلم ۔

مَنْ لَّمْ یَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ فَلَیْسَ مِنَّا۔ (ابوداؤد)

جو شخص تلاوۃ قرآن میں حُسن صوت و خوش الحانی ملحوظ نہ رکھے، وہ ہم سے بے تعلق ہے ۔!

رابعاً ۔۔۔ وُہ مَزَامِیرِ اٰلِ داؤد (علیہ السلام) کے نغمۂ موزوں کا مجذوب ہو!

جیساکہ اُس نے خود زبانِ نبوۃ کی ترجمانی کرتے ہوئے ان اوصافِ چہارگانہ کو اپنے مُندرجہ ذیل شعری مقولہ میں قلمبند بھی کیا ہے ؎

۔ باغ و بہار ما ندیم یعنی کہ جنۃ النعیم؟

رُوئے خوش است و خوئے خوش، بُوئے خوش و گلوئے خوش!

تو کیا اُس ذات کی موزونیٔ طبع پاکیزگیٔ فطرۃ اور ذوق شعر و حکمۃ پروری میں کوئی تردّد و تذبذب ہو سکتا ہے؟ ۔۔۔

۴ — جس ذات کو باب الولایۃ اسد اللہ الغالب سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ جو کہ
دُرجِ خلافت راشدہ کے آخری لولوئے تابدار ہیں، ریحانۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سید الامۃ سیدنا
حسن بن علی رضی اللہ عنہ کہ جنکے صدقہ میں امتِ مرحومہ قتل و غارۃ سے مامون ہوئی، نیز صلح و عافیۃ
اور امن و راحت سے فیضیاب ہوئی سید الاولیاء سید عبد القادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ
کہ جن کے دم سے دُنیائے ولایۃ و قلبیۃ میں بہارِ تازہ آئی اور عالمِ کشف و کرامۃ و مجاہدہ کی رونق
دوبالا ہوئی۔ مقبول بارگاہِ ایزدی، مستجاب الدعوات، قطب کامل و ولیِ عصر سید محمد بخاری
رحمہ اللہ کہ جنکی دعاء مقبول اور توجہِ باطنی کے طفیل سلطان مراد خان ثانی مرحوم کے ہاتھوں خدام الحرمین
ترکانِ احرار کی ڈوبتی ہوئی کشتی ساحلِ مراد تک پہنچی۔ شیخ الاسلام قاضی القضاۃ سید
عبد الغفار بخاری رحمہ اللہ کہ جنکے وجود کی برکت اور تاثیر علم و عمل سے سلطان زین العابدین
مرحوم والیِ کشمیر کے عہد میں ریاستہ اور اس کے نواح و مضافات تک قانونِ الٰہی کا سکہ
جما اور اسلامی حکومۃ کا پرچم لہرایا۔ مومنِ کامل مردِ مجاہد، مہاجر الی اللہ والرسول سید اکمل الدین
محمد بخاری رحمہ اللہ کہ جنہیں خاندان نقشبندیہ کے نامور بزرگ حضرت شاہ غلام علی دہلوی
قدس سرہٗ کے آستانہ سے صرف چند دنوں کی مصاحبۃ پر خرقۂ خلافۃ و پروانۂ بیعتہ و ارشاد عطا ہوا۔
اور وہ رنجیت سنگھ کے عہد میں اپنے مجاہدانہ عزم و سیرۃ اور مومنانہ فراستہ و تدبر کے باعث شہرۂ آفاق
رہے۔ ولیِ کامل صاحب الجلالۃ سید نور الدین بخاری رحمہ اللہ جو بتلاشِ مرشد میں حضرۃ خواجہ
شمس الدین سیالوی قدس سرہ کی خدمت میں چلے تو شیخ کامل پر بذریعہ کشف اس مرید
باصفاء اور طالبِ صادق کی جلالۃ قدر و عظمۃ شان منکشف ہوئی اور خانقاہ میں داخل ہونے سے پہلے
ہی حضرۃ خواجہ تعظیماً و استقبالاً استرو قد ہو گئے۔ اور خادم خاص بھیج کر سید مرحوم کو خانقاہ میں بصد احترام
بلوایا۔ اور بیعتہ کے چند روز بعد پروانۂ خلافۃ اور سند بیعتہ و ارشاد عطا کر کے رخصت کیا۔ زہدِ مجسم واصل باللہ

ولیِ وقت حضرۃ حافظ سید ضیاء الدین بخاری رحمۃ اللہ کہ جن کی ساری زندگی زہد و ورع عبادۃ و تقوے، صبر و حزیمۃ، ضبط و مجاہدہ، اور کفایۃ و قناعۃ کی فقیرانہ شان میں بسر ہو گئی۔
—— اِن اکابر رجال سے نسباً و مشرباً ابنیّۃ و ولدیّۃ حقیقیّۃ کی نسبۃ حاصل ہو —— مزید برآں عالم باعمل جامع شریعت و طریقۃ حضرۃ پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ سے نسبۃ بیعۃ و سلوک حاصل ہو۔ اور آج بھی قطب الوقت، امام العارفین، مرجع العلماء و الصلحاء، نقیب الزاہدین، بحر الشریعۃ و الطریقۃ حضرۃ مولانا الحاج الحافظ الشیخ عبد القادر رائپوری (مدّ اللہ ظلال برکاتہ ولازالت شموس فیوضہ و عنایاتہ ساطعۃ علینا و علی جمیع المتوسلین اجمعین) —— کے ساتھ نسبۃ بیعۃ و سلوک اور رابطہ خلافۃ و مجازیۃ نصیب ہو۔ یعنی جو سب بزرگوں کی مختلف نسبتوں کے طفیل چشتیہ، قادریہ سہروردیہ اور —— نقشبندیہ کے تمام خانوادوں کے فیوض و برکات کا مجمع و مظہر ہو —— کیا دریائے علم و معرفۃ میں اس کی پیرا کی و شناوری اور مدارج ولایۃ و سلوک سے اس کی آگاہی و آشنائی میں کوئی قدح کیجا سکتی ہے؟——

۵ —— جس ذات کی والد ماجد مرحوم جیسے مربیٔ کامل کی زیر نگرانی، عالم طفولیۃ میں مرحلۂ تکلّم تک —— پہنچنے پر قُلْ ھُوَ اللہُ اَحَدٌ کی صدائے سے شہادۃ توحید اور اعلانِ حقیقۃ کبریٰ کے ساتھ زبان کھلوائی گئی ہو، اور عدم بلوغ کی حالۃ میں ہی جس کا سینہ حفظِ کلام اللہ کا امانتدار ہو گیا، اور جس کے کام و دہن، حسن تلاوۃ و قراءۃ داؤدی کے متنادبن گئے ہوں۔ پھر جس نے طلب علم الٰہی کی راہ میں مبادی و مقدمات کے طور پر اردو اور فارسی نظم و نثر اور انشاء و ادب کی چوٹی کی کتب شرح صدر کے ساتھ از خود حل کر لی ہوں اور اساتذہ کرام کی ذات جس کے لئے محض وسیلہ کا درجہ رکھتی ہو اور علوم خادمہ —— یعنی منطق و فلسفہ، صرف و نحو، فقہ

واصول، اور حدیث وتفسیر ہیں جسنے محنت اور جد وجہد کے بغیر اعبارۃ ومعنی کا حقیقی ربط،
چند دلوں کے اندر اندر معلوم کر کے اساتذہ واکابر کی مخلصانہ و والہانہ دعاؤں کا قابلِ قدر
انعام پایا ہو — پھر — بمصداقِ قولِ معلمِ انسانیۃ وافقہِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم —

من یُرِدِ اللہُ بہٖ خیرًا یفقّھہ فی الدِّین (مشکوٰۃ)
خدا جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرلے اُسے دین میں سمجھ عطا کر دیتا ہے۔

— نیز —

خیرُکم مَن تعلَّمَ القرآنَ وعلَّمہٗ۔ (الحدیث)
تم میں بہتر انسان وُہ ہے جو علمِ قرآن حاصل کرے اور پھر اس کا علم عام کرے

جسنے اولاً اپنی زندگی کتاب اللہ کی صوری ومعنوی اقتداء واطاعۃ میں ڈھالی اور پھر
مدراس سے لے کر ہنگو، اور شملہ کی چوٹیوں سے لے کر بمبئی کے ساحل تک —
لاکھوں نہیں کروڑوں انسانوں کو — قرآن خوانی۔ قرآن فہمی۔ قرآن دانی اور
مطالباتِ قرآنی پر — ایثار وقربانی — کا سبق دیتے ہوئے مومنانہ فراست وجرأۃ
اور مجاہدانہ عزم وتدبّر کے ساتھ بسر کر ڈالی ہو — اور جسے وقت کے علماءِ ظاہر وباطن نے
ماہرِ اسرارِ کلام اللہ کا لقب دیکر اس کے علم وعمل بالقرآن کی صحیح داد دی ہو — کیا اس کی
فقاہتہ فی الدّین، اور اس کے سر پر آسمانی خیر وبرکۃ کے سایہ فگن ہونے میں کوئی تاویل کی جا
سکتی ہے؟ —

۶ — جس ذات کو عقلِ سلیم ودینی بصیرۃ نے اثناءِ تعلیم وتعلّم میں ہی ذاتی ماحول سے لے کر شہری
وقومی زندگی تک ہر گوشہ کی اِصلاح کے لئے آمادۂ ومستعد کر دیا ہو اور اس نے موت وحیوٰۃ،
شادی وغمی، تعلیم وتربیۃ، تہذیب وتمدّن، معاشرۃ واخلاق، تجارۃ واقتصاد، اور سیاسۃ

وحکومت جیسے اہم ترین موضوعات پر چند سال میں ہزار ہا مواعظ وخطبات وتقاریر کے ذریعہ
تبلیغ عقائد حقّہ، تنقیدِ رسوم قبیحہ، اِحقاقِ حق اور اِبطالِ باطل کا فریضہ بأحسن وجوہ ادا کیا۔
اور ہر کِہ ومِہ اور عامی وعالِم کو اعترافِ حقیقت پر — مجبور کر دیا ہو۔ جسکی مُصلحانہ روش اور
تجدیدی کارروائی نے لاکھوں انسانوں کی زندگی کا رُخ اوہام ورسوم، جاہلیّت وفرنگیّت،
بداَخلاقی وبدتہذیبی، اقتصادی بدحالی وسیاسی تباہی پر قناعت کئے رہنے کے بجائے — حکومت و
آزادی طلبی، وطن وملّت کی خودمختاری، فرنگ دشمنی وتردیدِ جاہلیّت، حسنِ معاشرت وتہذیبِ
اَخلاق، اعلانِ توحید وختمِ نبوّت، اور فی الجملہ شریعتِ اسلامیہ کے غلبہ واقتدار کی جدّوجہد
کی طرف موڑ دیا ہو۔ اور جسکی تاثیر قول وعمل سے ملک میں ایک مستقل جماعت وتحریک —
حُریّتِ اسلامیہ، کی داغ بیل پڑ کر ملک وملّت کی اہم ترین خدمات بجالانے کا ناقابلِ فراموش
تاریخی وانقلابی کارنامہ سرانجام پاچکا ہو، کیا اس ذات کی — ذہانت وطبّاعی، عقل وفراست
اور ملک وملّت کی صحیح نباضی کا اعتراف واقرار کئے بغیر کوئی چارۂ کار ہوسکتا ہے؟ —

۷ — جس ذات کو قُدرۃ علی الکلام، طلاقتِ لسانی، زبان آوری وصفتِ زُبانی کا جوہر فطرۃً ودیعت
کیا گیا ہو، انتخابِ موضوعات ومضامین اور تبدیلیٔ اُسلوب وطریقِ بیان میں وہ فرد ہو —
ساحرانہ تاثیر ونفوذ، جذبات آفرینی اور انقلاب انگیزی جسکی خطابت کا زیور ہو، تنقیدِ اعتراضات
وتردیدِ خرافات، اثباتِ معتقدات وتطبیقِ واقعات، نیز آیات واحادیث سے اِستدلال، اور
اَشعار ومُحاورات سے اِستشہاد میں جس کو مہارتِ تامّہ حاصل ہو، مزاح وتفنّن اور طنز وتحمیلِ ملیح
سے تزئینِ کلام میں جسکو درجۂ کمال حاصل ہو، زیرِبحث موضوع سے فنکارانہ گریز اور مقصودِ
خطاب کیطرف ماہرانہ رُجوع میں جسے یدِطولیٰ حاصل ہو۔ عوام وخواص کے دل ودماغ کو
آنسوؤں کی روانی اور قہقہوں کی پرواز کے درمیان اعترافِ حق وانکارِ باطل کی وادی میں

لاکھڑا کرنا اور اصحاب و احباب و اکابر کی دعاؤں کے جھرمٹ میں اغیار و اعداء پر صرف تیغِ زباں کے سہارے چھا جانا اس کے مقدر میں لکھا گیا ہو، جس کی مبلغانہ و متکلمانہ اوصافِ گرامی سے مزین و محلّے شخصیت کا اس نصف صدی میں ابھرنے والے ہر ذی استعداد مقرر اور فنکار خطیب نے بارہا اعتراف کیا ہو۔ چنانچہ :

مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے ایک دفعہ بے قابو ہو کر دفتر زمیندار لاہور میں خود ممدوح موصوف کے رُو برو یہ کہا "بخاری! — تو نے لوگوں کو اپنی تقریروں کا جو پلاؤ قورمہ کھلا کھلا کر ان کا دماغ خراب کر دیا ہے، ارے ظالم! اس کے بعد ہمارے ساگ ستو کو کون پوچھے گا؟" اور اس کے بعد فرطِ جذبات میں اُٹھ کر پیشانی چوم لی۔ پھر جب سیاسی اختلاف بڑھ گئے تو غالباً "ہمدرد" میں بہ انتباہ کر کے "ایک مشورہ" بھی قوم کو دیا کہ "یہ شخص جادوگر ہے، اسے تقریر کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ اس کا وجود بڑا خطرناک ہے، کیونکہ لوگ اس کی تقریر سے مسحور و مبہوت ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ چاہے تو انہیں اچھائی کے بجائے کسی غلط کام پر بھی آسانی سے آمادہ کر سکتا ہے۔ میرا بس چلے تو میں اسے کبھی تقریر نہ کرنے دوں" — اور یہ جذبات ہی گواہ ہیں کہ جوہر کا یہ رشک آمیز قول حریفانہ معاصرتہ اور رقیبانہ چشمک کا کس قدر صحیح آئینہ دار ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے تحریک خلافت میں بھی ممدوح شخصیت کی نمایاں خدمات کا اعتراف کیا، پھر اپنی بیعتِ امامتِ جہاد کے وقت جامع عالمگیری لاہور میں اس مبلغ اعظم اور خطیب امت کی قادر الکلامی و جادو بیانی اور عوامی جذبات و میلانات پر ضبط و توازن کا پہرہ بٹھا دینے کا نظارہ دیکھا۔ اور ایک مدت بعد سنہ ۱۳۶۵ھ / سنہ ۱۹۴۶ء میں وزارتی مشن کی آمد پر رجعت پسند افراد و ادارات کے خلاف اور قوم پرور و آزادی خواہ عناصر کی ترجمانی کرتے ہوئے دہلی

کے لئے بے مثال اور اپنی نوعیت کے آخری اجتماع میں اس کے حسنِ ادا کی تعریف کی۔ نیز۔
اس کے دینی و قومی شعور اور سیاسی تجزیہ پر تحسین و تصویب کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے کہ —
" میرے بھائی آپ کے اس بیان اور ان خدمت پر ملک و ملت
کا ہر گوشہ خوش اور شکر گزار ہے "
اور یہ کلمات ابوالکلام جیسی شخصیت کی طرف سے کسی انسان کے لئے اس کی کسی خوبی کا
بہت بڑا اعتراف اور گراں قدر ہدیۂ تشکر و تحسین ہے ۔
مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم — نے اُن کے سریع النفوذ مواعظ، مؤثر و جذبات
آفریں تقاریر، اور شعلہ بار خطبات کا غلغلہ سُنا تو احباب و متوسلین کے رُوبرو خانقاہ کی ایک
مجلسِ علم و عرفان میں — حضرۃ الاستاد مولانا — خیر محمد جالندھری مدظلہ کی شہادۃ کے
مُطابق اپنے خاص انداز میں فرمایا کہ " بھائی عطاء اللہ شاہ صاحب کی کیا بات کرتے ہو،
اُن کی باتیں تو عطاء اللٰہی ہوتی ہیں "
نواب بہادر یار جنگ مرحوم — نے اُن کا شہرۂ خطابت سنا اور اس کے اثرات محسوس
کئے تو یارانِ محفل اور رازدارانِ حقیقت کے سامنے متعدد بار تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کئے اور ایک
دفعہ بے اختیار ہو کر ایک خاص دوست سے یہ کہہ ڈالا کہ —
" اے کاش! میں اس شخص کو مسلم لیگ میں لا سکتا؟ اگر یہ میرے ساتھ ہو تو چھ ماہ کے اندر اندر
ملک میں انقلاب برپا کر دوں " ۔
مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم — ایک دفعہ حضرت ممدوح کی سخت علالت پر دہلی میں بغرض عیادۃ و
مزاج پرسی ان کی قیام گاہ پر پہنچے اور حالۃ غیر دیکھی تو اظہارِ حیرۃ و افسوس کرتے ہوئے فرش پر بیٹھکر
اُنکی تقریر و خطابت کے ذریعہ انجام دی ہوئی خدمات کی ضمناً اہمیۃ بیان کی اور آئندہ کیلئے اُنکی منزوۃ پر حسبِ ذیل تبصرہ کیا کہ —

"شاہ جی! آپ تو بہت کمزور ہوگئے! میں تو سمجھا تھا کہ معمولی تکلیف ہے، مجھے کیا خبر تھی کہ تم اس حالت کو پہنچ گئے ہو۔ شاہ جی! تم کسی ایک کے نہیں ــ تم تو سب کے ہو۔ تمہیں اس حال میں دیکھ کر مجھے بڑا دکھ ہوا ہے۔ تم نے پہلے بھی بڑا کام کیا۔ اور ابھی تمہیں بہت کچھ کرنا ہے شاہ جی ــ اپنی صحت کا بہت خیال کرو ــ تم اپنے اس وجود کو اپنا نہ سمجھو یہ تمہارا نہیں ــ کسی کی امانت ہے۔ شاہ جی! تم تو ــ اسلام کی مشین ــ ہو، تمہاری ابھی بہت ضرورت ہے"

قاری محمد طیب قاسمی ــ نے راقم السطور کے نام ایک ذاتی مکتوب تحریر فرمایا تو ضمناً میری ادبی تحریک کو سراہتے ہوئے شہادتِ واقعہ کے طور پر یہ کلمات بھی سپردِ قلم کئے کہ ؎

"حق تعالیٰ ــ کا شکر ہے کہ جس افادیت کو ہمارے محترم بزرگ حضرت شاہ صاحب نے ــ تبلیغی رنگ ــ میں قائم کیا اور ایک ــ "بے مثال خطابت" ــ کے ذریعہ دنیا کو فائدہ پہنچایا ــ آپ نے بھی الولدُ سرٌّ لابیہِ (بیٹا اپنے باپ کی رمز اور بھید ہوتا ہے)۔ کے مطابق اُسے قائم ہی نہیں رکھا بلکہ پائیدار بنانے کی جدوجہد کی ؎

فَکُلُّکُمُ اَتیٰ مَاٰتیٰ اَبِیہِ ــ فَکُلُّ فِعَالِ کُلِّکُمُ عُجَابٌ"!

(تم سب اپنے باپ دادا کی جگہ پر ہی آئے ہو، تم سب کے سبھی کام خوش کن اور حیرت انگیز ہیں!)

الغرض یہ تمام اقوال اس صدی کے سربرآوردہ مقررین اور اس برِّعظیم کے آئمہ خطابت کی پُراثر نفسیاتی واردات و کیفیات کا خاکہ اور ان کے جذبات و احساسات کی غیر اختیاری تعبیرات کا آئینہ ہیں۔ نیز مذکورہ ہستی کے حق میں "تحسین آشنا" اور "کلام سخن شناس" کا مصداق ہیں اور بتقاضائے قولِ شاعر ؎

وَمَلِیحَۃٌ شَھِدَتْ بِھَا ضَرَّاتُھَا ــ وَالْفَضْلُ مَا شَھِدَتْ بِہِ الْاَعْدَآءُ

(وہ حسنِ ملیح کا مرقع محبوب کہ جس کے کمال خوبی پر اسکے رقیب بھی گواہی دیں۔ ممتاز جہاں وہی ہے اور فضیلت اسی کو حاصل ہے)

کیونکہ — وبضدہا تتبین الاشیاء

اشیاء کا حسن و قبح اپنی ضد اور مد مقابل سے ہی خوب روشن ہوتا ہے ۔

جسکے متعلق بلا مبالغہ کہا گیا، کہا جاتا ہے اور کہا جائیگا کہ جسطرح امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد — علمی تحریر و تقریر کے بادشاہ ہیں؟ ویسے ہی حضرۃ امیر شریعۃ مدظلہ بھی عوامی خطابۃ و تحریر کے امام و امیر ہیں ۔ نیز لسانی و قومی خصوصیات کے اعتبار سے ایشیا اور اپنی نوعیۃ و حیثیۃ کے لحاظ سے دنیا کے بیمثال مقرر و خطیب ہیں ۔ جنکی زبان آوری، فی الواقعہ بھی اس دور میں سحبانِ وائل کی بلا تکرار و مسلسل تقاریر اور علیِ مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کے جلال آمیز و پرشکوہ خطبات کی صدائے بازگشت ہے ۔ اور جن کی خطابۃ طربیہ و حزنیہ، موعظۃ و عبرۃ تبلیغ و اصلاح، اور تجدید و انقلاب غرضیکہ کلام کے ہر پہلو کا سلیس و رواں حسین و شگفتہ اور موثر و نتیجہ خیز نمونہ کہی جاسکتی ہے ۔ حتیٰ کہ اُسے مذکورہ آثار و شواہد کی روشنی میں اگر میدان وغا میں عرب شہسوار کی ٹکراتی ہوئی تلواروں کی جھنکار — لپکتے ہوئے نیزوں اور لپکتے ہوئے تیروں کی سنسناہٹ سے تشبیہ دیجائے یا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے عسکری قافلوں کے حُدی گو اور رجز خوانوں کے نغمۂ موزوں سے استعارہ کیا جائے تو خلاف حقیقۃ نہ ہوگا ۔ کیا پھر ایسی شخصیۃ کے جوہر فصاحۃ و بلاغۃ اور قوۃ کلام و خطابۃ — کے متعلق مذکورہ تشبیہ و استعارہ میں کوئی لفظی یا معنوی قدغن لگایا جا سکتا ہے؟ ۔

۸ — جس ذات کے حسن قراءۃ کی جاذبیۃ اور موزونی تلاوۃ کی دلبستگی کا یہ عالم ہو کہ اہل اسلام اُسے نزولِ وحی کی کیفیۃ سے مشابہ کہیں، غیر مسلم اُسکو محض اسلئے سُنیں کہ وہ دماغی سکون کا باعث اور قلبی وجد و سرور کی ضامن ہے، اور مسلم و غیر مسلم بلا تفریق دین و ملۃ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں جس شخص سے لحن داؤدی اور حسین قراءۃ کے جلو میں صرف اس مقصد کے لئے کلام الٰہی

سننے کو بیتاب رہتے ہوں، کہ اس کی تشریح و بیان میں فکر و تعقل کے لئے ایک قابل غور و تدبر دعوۃ پوشیدہ ہے۔ اور ایک قابل عمل و باعث نجاۃ و مغفرۃ پیغام مضمر ہے جس کی تلاوۃ قرآن ___ و بیان تفسیر کے طفیل لاکھوں مسلمانوں کے عقائد و اخلاق اور اعمال میں ایک خوشگوار تغیر پیدا ہوا۔ سینکڑوں ہندوؤں سکھوں اور مسلمانوں کی زندگی میں ایک باطنی انقلاب برپا ہوا اور انہیں کلمۂ ہدایت و دعوۃ اسلام قبول کرنے کی سعادۃ نصیب ہوئی۔ تو کیا ایسے حامئ کتاب الٰہی کی شکوہ پرور تلاوۃ اور مؤثر بیان و تفسیر کی نفع بخشیوں اور خیر آفرینیوں میں کسی احتمال کی گنجائش ہو سکتی ہے؟ ___

9 ___ جس ذات کو جذبۂ ایثار و سخا وراثۃ میں ملے اور اس کا اپنا عمل انفرادی طور پر انفاق فی سبیل اللہ کی مختلف صورتوں میں یہاں تک پہنچ چکا ہو کہ وقت آنے پر وہ تن کے کپڑے بھی اتار کر صحیح ضرورۃ مند کی ستر پوشی کر ڈالے اور اجتماعی نقطۂ نظر سے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز شئے ___ جان ___ کو دینی و ملی جہاد میں قید و بند اور دار و رسن ___ کی سختیاں جھیلنے کیلئے خدا کے سپرد کر دے، اور عمر کا ایک ___ گراں قدر حصہ ___ سنت یوسفیہ ___ علیٰ نبینا و علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کی پیروی کے لئے ___ وقف ___ کر ڈالے۔ غرض جس نے ___ نہ افراد کے سوال و طلب پر انہیں کبھی خالی ہاتھ لوٹایا۔ اور نہ دین و ملت ___ کی ___ اجتماعی پکار ___ پر ہی کبھی اپنے جان و مال اور وقت ___ کی قربانی ___ سے دریغ و انحراف کیا ہو! ___ بلکہ ہمیشہ السابقون الاولون کی صف میں کھڑے ہو کر احباب و اغیار کے لئے ایک اسوہ اور مثال قائم کی۔ اور زمانہ و تاریخ جسکے وصف و کردار کے لئے اٹل گواہ ہوں ___ تو کیا اس شخصیۃ کے انفرادی جذبۂ جود و سخا ___ اور ___ اجتماعی ولولۂ ایثار و قربانی پر کوئی انگشت نمائی کی جا سکتی ہے؟ ___

۱۰ — جس ذات نے بچپن کی معصوم ساعتوں سے لے کر جوانی کی پرخطر راہوں تک کا سفر رُشد وصلاحیۃ اور سعادۃ و فیروزمندی کے ساتھ طے کیا۔ اور آباؤ اجداد کی سنّتِ قدیمہ اور اکابر و مشائخ کے طریقۂ دائمی کے مطابق توجّہ الی اللہ، ذکر و مراقبہ، ادائے فرائض و نوافل، قرآن خوانی، تہجّد گزاری و شب زندہ داری کے لئے پابندِ دستور ہو کر چلّہ کشی کی۔ حتّٰی کہ صومِ وصال رکھکر متواتر دو دو سال تک روزانہ بلاناغہ چھ گھنٹے میں قرآن کریم ختم کیا ہو اور جس کے اپنے قول کے مطابق کہ —

" ستاروں ——— سے میں نے بازی لگا رکھی تھی پھر یہ کبھی نہیں ہوا کہ ستارہ پہلے طلوع ہو اور میں پیچھے جاگوں، میں نے ہمیشہ اس کو شکست دی، ہمیشہ پہلے اُٹھا اور معمولات پورے کئے۔ پھر خدا کی جو جو رحمتیں نازل ہوئیں اُنکا کیا ٹھکانا ہے، لطائف کُھل گئے، میں فضاؤں میں پرواز کرتا۔ اور ارواحِ قدسیہ سے ہمکلامی کی کیفیۃ محسوس کرتا تھا۔ رُوح کا تو یہ حال تھا، لیکن جسم کی یہ کیفیۃ تھی کہ شب و روز جو کے ستو میں صرف نمک اور پانی مِلا کر یا تنُور کی پکی ہوئی خشک روٹی کے خستہ ٹکڑے ——— کھاتے رہنے سے میں سُوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا " ——— !

اپنے خالق و معبود کے ساتھ عبدیۃ و مخلوقیۃ کا جس شخص نے ایسا رشتہ قائم کر لیا ہو، اس کی زُہد پروری اور عبادۃ گذاری میں کوئی شُبہ کیا جا سکتا ہے ——— ؟

۱۱ ——— جس ذات کا عہدِ طفولیتہ قانونِ فطرۃ کی ودیعۃ کردہ معصومیۃ کے باوجود بشری

اقتصاد سے پیدا ہونے والی سختیوں اور تنگیوں سے بھی خالی گذرے، پھر بلوغۃ کا دور طلب علم وفضل، کسب معیشت کے لئے سفر ومحنت اور تکمیل سیرۃ کے لیے مجاہدہ ومراقبہ کی وادیاں عبور کرتے ہوئے بسر ہو، پھر صحۃ وتوانائی کا مرقع شباب تازہ، اور غضب کی محبوب دلفریب اور قابلِ رشک جوانی کا آزمائشی زمانہ، درونِ خانہ اور بیرونِ در، احباب واغیار، اور معاصرین واکابر کی شہادۃ کے ساتھ سلکھ اسکے اپنے قول کے مطابق یوں بیت جائے کہ ؎

"دنیا میں تین چیزیں حقوق العباد کی بنیاد ہیں۔ جان، مال، آبرو۔ اور ان تینوں کے متعلق (علی الترتیب) دنیا میں کوئی شخص اس بات کا دعوےٰ نہیں کر سکتا، کہ میرے ہاتھ سے اسکو کوئی آزار پہنچا ہو۔ ہتھیار تو خیر بڑی چیز ہے، میں نے آج تک کسی شخص کو ایک تھپڑ بھی نہیں مارا۔ رہا مال، سو اس کے متعلق بھی کوئی شخص یہ دعوےٰ نہیں کر سکتا، کہ میں نے اس کا روپیہ، پیسہ غصب کیا ہو یا امانتہ میں خیانتہ کی ہو۔ یا لے کر واپس نہ کیا ہو، اگرچہ یہ تو ہوا ہے کہ میں نے کچھ دیکر واپس نہیں لیا۔ اور اب بھی اگر دنیا داروں کی طرح سوچوں، تو ہزاروں نہ سہی دو چار سو کی معمولی رقم کسی نہ کسی کے ذمہ نکل ہی آئے گی! خود میں فقیر ہوں، میرے پاس تو کیا ہو گا۔ البتہ آج سے نہیں ہمیشہ سے ہی لوگوں کے روپے پیسے اور جماعتی امانتوں کا بحمد اللہ کفیل اور محافظ رہا ہوں، اور کہہ سکتا ہوں، کہ اِنِّی لَقَوِیٌّ اَمِیْن! سب سے آخری اور سب سے زیادہ نازک چیز انسان کی عزۃ وآبرو ہوتی ہے۔ تو الحمدللہ! کہ آج تک میری آنکھ میلی نہیں ہوئی، اور دنیا میں کسی کی ماں بہن یا بہو بیٹی کی عزۃ آبرو کو میری ذات سے گزند نہیں پہنچا، حالانکہ جہاں میں جوان ہوا وہاں شب وروز لوگوں کے ننگ وناموس سے میرا واسطہ تھا لیکن ان کو ہمیشہ ماں، بہن اور بیٹی ہی سمجھا، کہا اور بنا کے رکھا، الحمدللہ کہ اسوقت

ملک بھر میں میری ہزاروں مائیں بہنیں اور لاکھوں بہو بیٹیاں ہیں، اور میں اپنی اولاد کے علاوہ ہزاروں بھانجوں بھتیجوں، نواسوں اور پوتوں والا ہوں — اور اس میں میری کوئی خوبی نہیں — میں یہ نہیں کہتا کہ میں متقی اور پارسا تھا یا ہوں بلکہ سیدھی سادی بات یہ ہے کہ مجھے اپنے باپ دادا کی عزۃ کا پاس تھا، اور ہے، مجھے تو ان کی پگڑی کی لاج رکھنی تھی تاکہ یہ نہ کہا جائے کہ خاندان سادات بخارا کا لڑکا — سید نور الدین کا پوتا، اور حافظ سید ضیاء الدین کا بیٹا ایسا ویسا نکلا۔ اور اس کے بدلے میں نیکوں کا یہ گھرانا بدنام ہوا۔ باقی اللہ کا خوف تو بڑی بات ہے اور خوش قسمۃ ہے وہ جسے یہ چیز حاصل ہو۔ سو الحمد للہ کہ اس بارہ میں انگلی سے غیر محرم کو چھونے، اور نگاہ تک غلط نہ ہونے کی بھی قسم کھا سکتا ہوں ——

وَذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ — !"

تو جس شخص کے حق میں یہ عظیم الشان، نادر الوجود، اور مثالی کیرکٹر — زبان حال سے گواہی دے اور فضل خداوندی اس انداز میں اس کا شامل حال رہے، کیا اس ذات کی امانۃ و دیانۃ اور — عفت و اخلاقی پاکیزگی — پر کوئی حرف آسکتا ہے —— ؟

۱۲ — جس ذات نے ذاتی آزمائشوں، اور قومی و دینی ابتلاآت میں کبھی جی نہ ہارا، حتیٰ کہ گھر بار، اہل و عیال، آرام و راحۃ اور جان تک کو مقصد پر ترجیح دی، خدا کی راہ میں تمام رکاوٹوں کو خواہ وہ ابناء وقت، غداران ملک و ملۃ، اجیران فرنگ، اور دشمنان خدا و رسول اشخاص کی صورۃ میں پیش آئیں یا شیطان کے پھیلائے ہوئے دام تزویر و تلبیس یعنی سیاستِ فرنگ — کی قلابازیوں اور دسیسہ کاریوں کی شکل میں جس ذات نے کبھی پرکاہ کے برابر وقعۃ نہ دی، بلکہ ہمیشہ نام و شہرۃ، جاہ و مرتبہ اور مال و زر کے پجاریوں اور اخوان الشیاطین، کی حیلہ بازیوں کے علی الرغم — مومنانہ خلوص و فراستہ، مجاہدانہ سادگی، اور

صبر و حوصلہ کے باطنی اسلحہ اور وسائل استعمال کئے، اور محض فضل خداوندی، اور ارواح انبیاء و صلحاء رضوان اللہ علیہم اجمعین، کی تائید اور مشائخ و اولیاء رحمہم اللہ، کی دعاؤں کے روحانی سہارے پر ہر دینی تحریک اور قومی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ہر ملکی مصیبۃ میں انفرادی اور جماعتی مخالفتوں کے طوفانِ بدتمیزی کی سینے پر ٹکر لی۔ اپنوں اور بیگانوں کی جہالتوں اور حماقتوں کا تذلیل و انتقام کے بجائے تبلیغ و اصلاح اور عفو و درگزر سے جواب دیا، اور اپنی اس روش میں ہمیشہ مصلحانہ اخلاق اور پیغمبرانہ اسوہ کو مشعلِ راہ بنایا ہو، تو کیا اس ذات کی ظاہری بطولۃ و جوانمردی اور روحانی بسالۃ و شجاعۃ پر کوئی طعن کیا جا سکتا ہے؟ —

۱۲ — جس ذات کو ہر محفل و مجلس اور اجتماع و جمعیۃ میں ذاتی صلاحیۃ اور قومی عزم و استعداد کی بنا پر ہمیشہ قدر و منزلۃ، عزۃ و احترام اور عقیدۃ و ارادۃ کی نگاہ سے دیکھا اور سر آنکھ پر بٹھایا گیا ہو، جسے ہر ادارہ اور جماعت نے جس میں اسے کسی بھی حیثیۃ سے شریک و دخیل ہونے کا موقع ملا ہو، توقع اور آرزو کو التجا کے رنگ میں لا کر اعزاز و عہدہ کی پیشکش کی ہو لیکن اس فقر و استغناء کے دھنی اور دنیاوی شہرۃ و منزلۃ سے ہمیشہ نفور و کنارہ کش —— رہنے والے شخص نے جسے ہمیشہ ٹھکرا یا اور اپنے سے بدرجہا کمتر لوگوں کو محض اخلاص و ایثار، اطاعۃ کیشی، مقام و فرض شناسی اور ہمۃ افزائی — کے نقطۂ نظر سے آگے بڑھایا، بلکہ اپنی زبان اور توجہ سے اسے پروان چڑھایا اور اس عمل کو بھی علانیۃ — یا در پردہ اپنی تحسین و تعریف کا سامان اور حیلہ نہ بنایا، پھر ان سب باتوں کے باوجود جسکا وجودِ گرامی ہر مسئلہ و معضلہ میں حل طلب دماغوں اور متجسس و استفسار آمیز نگاہوں

کام کرتا رہتا ہو جسکے اقوال واشارات یا بیانات و فیصلہ جات ابتداءً — صدیٰ ایک درویش یا زیادہ بہ مجذوب سمجھے گئے اور انجام کار خدشات و احتمالات کا واقعات و حقائق کی صورت میں اِلہامی جواب قرار دیئے گئے، اور اب بھی ان کے متعلق یہی عقیدہ ہزاروں نہیں لاکھوں نیاز مندوں کے دل و دماغ پر حاوی اور محیط ہو کہ اس کی باتیں جذبات و تصوّرات کے بجائے وجدان و بصیرۃ کی عکّاس ہوتی ہیں، اور اس کے اپنے قول کے مطابق کہ ؎

" بھائی — ہم لوگ آندھی بن کر اُٹھے اور بادل بن کر برس گئے ہمتیں اور کام کی دُھن لے کر چلے لیکن، اخلاص کے ساتھ، اور اس خیال سے کہ ہمیں کام کرنا ہے نام نہیں چاہئیے ہمیں معلوم ہے کہ ملک کی تمام جماعتوں اور ان کے لیڈروں اور کارکنوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ اور پھر ان کے آغاز و انجام کا حال بھی معلوم ہے، اور ہم فقیروں کی ٹولی کا حال ساری دُنیا جانتی ہے — لوگ تعجب — اور حیرۃ — سے پوچھا کرتے ہیں کہ یہ آپس میں کبھی بھی نہیں لڑتے، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ — اگر موقع ہو تو بتاؤں کہ یہی ایک بات — راز — کی ہے، ورنہ ہمارا تمام زندگی میں کوئی راز تھا، نہ ہے، نہ ہوگا۔ کہ ہم جمع ہوئے تو قوم و ملک اور دین کے لئے نہ محض عہدوں اور وزارتوں کے لئے، نہ مال و دولۃ اور شہرۃ و ناموری کے لئے، ورنہ اس حساب سے ہم میں بہت سے ساتھی کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے، کئی زمیندار اور بڑی شان کے آدمی تھے۔ اور مختلف قسم کی دنیاوی قابلیتوں کے مالک تھے۔ اور کئی دینی علم اور نیکی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھے۔ لہٰذا ان میں کسی سے بڑھ جانے یا کسی پر حسد و رقابت کی نوبت ہی نہیں آسکتی تھی — بس — بات ایک ہی تھی اور وہ یہ کہ کام کیا جائے

جس سے جماعت کا بھلا ہو، قوم اور ملک کا بھلا ہو، چھوٹے آگے آئیں اور بڑے تدریجاً پیچھے ہٹیں اور صرف رہنمائی کریں، کوئی مسئلہ درپیش ہو تو مشورہ دیں اور عملی طور پر ہاتھ بٹائیں۔ اور مرنے کا وقت آئے تو سب کارکنوں اور رضاکاروں سے آگے ہوں تاکہ محض لیڈری نہ رہے — آخر جنہیں لوگوں کی اولاد کا خیال نہ رہے، وہ اپنی اولاد کے لئے کب مخلص ہو سکتے ہیں! ہمیں آج کل کے خود غرض سیاسی لیڈروں کی طرح منہ پر تعریف، اور در پردہ سازشیں کرنے کا ڈھنگ ہی نہیں آیا (اور خدا کی لعنت ہو ایسی منافقانہ رفاقت پر) ہم نے کبھی ایک دوسرے کو کہنی مار کر — پیچھے نہیں ہٹایا تاکہ — اپنا مقام بنا سکیں، بلکہ جس کو — قابل — دیکھا۔ اسکو آگے کیا، اور اس کا یہ حال دیکھا کہ وہ دوسرے ساتھیوں کی منت کر رہا ہے کہ خدا کے لئے مجھے عہدہ مت دو، مجھ سے کام نہیں ہو گا — بس اصل بات یہی تھی کہ ہم — عہدوں کیلئے کام — نہیں کرتے تھے، بلکہ — کام کیلئے عہدے — مجبوراً قبول کرتے تھے، اور میں تو ساری زندگی اس پر بھی راضی نہیں ہوا، کہ عہدہ قبول کروں، اور اگر مجبوراً دوستوں نے کبھی کھینچ گھسیٹ کے کچھ بنا بھی دیا تو بھی اپنی رائے اور ذاتی خیال کو کوئی درجہ نہیں دیا بلکہ جو کیا مشورہ سے کیا ہمیشہ اطاعت کی اور اکثر تکلیف اٹھائی لیکن ڈسپلن اور فیصلہ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اختلاف رائے اور لڑائی جھگڑا ہم اندر بیٹھ کے کر لیتے تھے اور باہر نکل کر جو ایک کہتا وہی سب کی آواز ہوتی اور جو ایک کرتا سب اسکی عملاً تائید کرتے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہر آدمی اگر بڑا بننے کی فکر میں رہے، کام رک جائے گا۔ کچھ لوگ قوموں اور جماعتوں میں ایسے بھی ہونے چاہئیں، جو بنیاد کا پتھر بن کر عمارت کے نیچے دب جائیں جن پر کسی کی نگاہ بھی نہ پہنچے، تعریف کرنیوالے عمارت کی بلندی اور اس کے طرز تعمیر کی تعریف کریں، لیکن حقیقت پر نظر رکھنے والے ان پتھروں کو

دعائیں دیں، جن پر ایسی مضبوط و بلند اور خوبصورت عمارت قائم ہو، بات کہنے کی نہیں ــــ لیکن جب میں آج کل کے واعظوں مبلّغوں اور مقرّروں کو شہرت کے لئے دربدر ہوتے دیکھتا ہوں تو پھر خدا کے اس فضل وکرم پر جو ہمیشہ سے میرے شامل حال رہا اور ہے، اور جو کچھ بولنے کی نعمت اور عزت خدا نے مجھے نصیب کی اس پر غور کرتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ اللہ تعالے نے مجھ جیسے بے ہنر انسان سے کتنا اور کیا کام لیا، ایک وقت تھا جبکہ آج کے بولنے والے پیدا بھی نہیں ہوئے تھے تو مجھے ملک کے بعض حصوں اور خاص علاقوں میں، لاکھوں انسانوں کو صرف لفظ ــــ السّلام علیکم ــــ سکھانے میں ہی کئی برس لگ گئے مسائل تو رہے ایک طرف، اٹھنے، بیٹھنے، بول چال، ملنے جلنے، حتیٰ کہ بعض علاقوں میں مدّۃ تک پیشاب، پاخانے، پر بھی تقریریں کرنی پڑیں، کیونکہ جب مردوں اور عورتوں کو بے تہذیبی عریانی اور بے حیائی میں مبتلے دیکھا تو اسی پر مہینوں بولنا پڑا، اور بتایا کہ دیہاتی اور شہری دونوں کو کس طریقہ سے بیت الخلا کی سہولۃ مہیا کرنی چاہیئے خصوصًا عورتوں کی بے حرمتی سے مجھے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ باپ، بھائی اور شوہر گھر میں بیٹھے ہیں اور مائیں بہنیں اور بہو بیٹیاں ضروریات سے فارغ ہونے کے لئے غیر مردوں کے سامنے باہر جنگل کو جا رہی ہیں، چنانچہ میں نے اس بد رسم کا سدِّ باب کرنے کے لئے بارہا تقریریں کیں اور کئی جگہ پر تو میں نے خاص خاص لوگوں سے کہہ کے اُن کے گھروں میں سنڈاس تک بنوائے، اور تو اور سرحد میں یہ چیز میرے لئے سخت حیرۃ اور پریشانی کا باعث بنی۔ لیکن وہاں یہ فرق تھا کہ جب اُن لوگوں کو ــــ اس بارہ میں شرم دلائی تو اس کا بہت جلد اثر ہوا، کیونکہ وہ لوگ ابھی بھی غیور ہیں۔ الغرض تبلیغ کے راستے میں عقائد باطلہ کے ٹیلوں اور تودوں کو ہموار کیا، جاہلانہ رسم ورواج کے جھاڑ جھنکار صاف کئے، مخالفۃ وعداوۃ کے گڑھوں کو پُر کیا، مزدوروں کی طرح

پتھر ڈھوئے اور کوٹے، مٹی اور بجری کی ٹوکریاں کندھوں پر اٹھائیں اور اسے بچھا کر اس پر
تارکول ڈالا، پھر خود ہی انجن کی طرح راستہ برابر کر دیا، اور مدتوں کی جانکاہی کے بعد جہاں
چلنا مشکل اور ایک قدم اٹھانا بھی دشوار تھا، وہاں پیدل تو کجا، پھر گدھا گاڑی سے لے کر
موٹر تک سب کچھ چلا، اور اب توہماری ان خود ساختہ اور پامال کردہ راہوں پر کتے بلے بھی
دوڑتے پھرتے ہیں، لیکن دیکھنے والا سڑک کی کشادگی اور ہمواری کی تعریف کرتا ہے
وہ تو شاید لاکھوں میں کوئی ایک ہوگا، جسکی نگاہ سڑک بنانے والے اور اس کیلئے جان کھپانے
والے کو تلاش کرتی ہو ـــ ؟"

جس شخص عظیم نے بایں طور زندگی کے فرائض میں ٹھوس اور بنیادی جد وجہد کا امتیاز
حاصل کیا، حتیٰ کہ اپنے وقت کی اہم ترین علمی و دینی شخصیت حجۃ اللہ فی الارض شیخ الاسلام
حضرۃ علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہٗ نے ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۱ء
میں برصغیر ہندوستان کے تقریباً پانچ سو نمائندۂ قوم اور جید علماء و صلحاء کی معیۃ میں جس
شخص کے ہاتھ پر سیاسی قیادۃ اور دینی امارۃ کے لئے خود بیعۃ جہاد و امارۃ کی رسم ادا کی
ـــ (اگرچہ وہ اس بیعۃ کے وقت بھی خود ہی حقیقی مقتدیٰ اور رہنما تھے) ـــ
اور اسے مسلمۂ ملک و قوم ـــ امیر شریعۃ ـــ و ـــ زعیم ملۃ ـــ منتخب کیا،
تو کیا ان تمام احوال و کوائف کے باوجود مذکورہ ہستی کی امیرانہ صلاحیۃ ـ کی
اصابتہ و خوبی، زعیمانہ استعداد کی پختگی، اور اسکے قائدانہ اوصاف
و شمائل ـــ میں کوئی مبنی مبخ نکالی جا سکتی ہے ـــ ؟

۱۴ ـــ جس ذات نے دورِ غلامی کی جکڑ بندیوں اور دشمن خدا و رسول ـــ فرنگی ـــ
(لعنہ اللہ و خذلہ) کی قہرمانی قوۃ و سلطنۃ کی ظالمانہ کارروائیوں کے علی الرغم عقائدھم،

کی تبلیغ ـــ فرقِ باطلہ کی تردید ـ غلامی اور نوکرشاہی کی مخالفت اور تحریک آزادی کی تائید و حمایت کی ـ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، توحید اور ختم نبوۃ ـ و استیصال مرزائیت ـ جیسے فرنگی دشمن ـ مدارِ ملک و ملت اور اہم ترین مسئلہ میں قوم کی قیادت کی، تن تنہا تمام افراد اور جماعتوں کے قولی و عملی کارناموں سے زیادہ وزنی، مؤثر اور نتیجہ خیز مہم سر کر ڈالی! ـ نیز عزم و ہمت اور توکل کے گھوڑے پر سوار ہو کر ـ کتاب اللہ ـ کے آسمانی اسلحہ سے لیس ہو کر مسیلمہ کذاب ـ اسود عنسی ـ طلیحہ ـ اور ـ حسن بن صباح کے جانشین ـ دجال اعظم مرزائے کادیانی (قبح اللہ وجھہ و اخزاہ و کل من تبعہ فی الدنیا و الآخرۃ۔ آمین !!!) کی نبوۃ کاذبہ و باطلہ ـ کے عظیم و ہیبت ناک قلعہ پر تابڑ توڑ حملے کرکے اسکی اینٹ سے اینٹ بجا دی، اسکے دجل و تلبیس اور اغوا و فریب کی دھجیاں بکھیر دیں ـ ازلی غلامانِ کفر و ارتداد، جاسوسانِ فرنگ و دم بریدہ سگانِ برطانیہ، امتِ مرزائیہ ـ کے مذہبی و سیاسی فراڈ کے ہولناک بت کو میدانِ رزم و مقابلہ میں جرح و استدلال کی بمباری سے اس طرح چکنا چور کیا۔ کہ آج اسکا یہ عظیم کارنامہ دینی و قومی تاریخ، اور بین الاقوامی اہمیت کے نقطۂ نظر سے شہرۃ لازوال حاصل کرکے ایک مستقل ـ تحریک ـ کی شکل اختیار کر چکا ہے جس کی گونج گرج سے ایوانِ فرنگ کے در و دیوار لرز رہے ہیں، جس کی کفر سوز سرگرمی اور ارتداد کش تاثیر کی بدولت کادیان و ربوہ کے جعلی بہشتی مقبرہ ـ کی غلیظ و بوسیدہ ہڈیاں چیخ رہی ہیں، تبلیغ و اعلانِ حق کے لئے جکی

شہسوارانہ یلغار اور استیصال کفر و خاتمۂ ارتداد کیلئے جس کی مجاہدانہ غارۃ گری آج عقیدۂ توحید و ختمِ نبوۃ کی فتح مبین اور فوز و کامرانی کے نتائج و آثار پیدا کرنے کا موجب بن رہی ہے۔ تو کیا اس ذات کی یہ غیر فانی مجاہدانہ جد و جہد اور مدارِ نجاۃ و مغفرۃ اسلامی تحریک کسی اعتراض و اختلاف کا ہدف بنانے کے قابل قرار دیجا سکتی ہے؟

۱۵ — جس ذات کے حسب و نسب کی صحۃ اور خاندانی شہرۃ نیز ہر دور میں خواص و عوام کیطرف سے اس کے خانوادہ کو اعتماد و مقبولیۃ کی سند ملے اور اس خاندان کے بیشتر افراد اپنے فضل و شرف کی بناء پر اپنے اپنے زمانہ میں تحقیق نسباً در سیادہ و نجابتہ کا معیار بنتے رہے ہوں یعنی جسے طبعی اور خلقی طور پر بھی شرافۃ و پاکیزگی کا امتیاز حاصل ہو اور باطنی لحاظ سے بھی تقدس و طہارۃ نسلاً بعد نسل جسکی فطرۃ کا خمیر ہو — حتیٰ کہ شجرۂ نسب اور تاریخ — کی رسمی تائید کے علاوہ اہل باطن — میں سے کیا سالکین — اور کیا مجذوبین — ہر ایک نے متعدد بار مبشرات و رؤیائے صالحہ اور کشف و الہام کے ذریعہ بھی جس کے حسب پر تحسین و آفرین کہی اور صحۃ نسب کی تصدیق کی ہو اُسکے حسیب و نسیب ہونے اور اس کی سیادۃ و سروری — میں کوئی کلام ہو سکتا ہے — ؟

نہیں اور ہرگز نہیں!

ب م — مندرجہ بالا فقرہ جواب ہے گزشتہ تمام معنی خیز اور حیرت انگیز علمی و ادبی اور تاریخی سوالات کا اور مذکورہ سوالات میں استفہام آمیز انکاری رنگ ہی دراصل جواب و اقرار کا حاصل اور راز خود کوئی جواب دئے بغیر تائید و اثبات کا آئینہ دار ہے۔ بلکہ حقیقۃ تو یہ ہے کہ اگر محض ان سوالات کی ایک تصویر بنا کر صرف مسئول عنہ کی ذات کو اس کے تمام اوصاف و اعمال کی روشنی میں ایک نظر دیکھ لیا جائے، تو بقول کسے ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال!

یہ سوال نامہ یا استفساری دستاویز آپ کو مبنی بر حقیقت اور مطابق واقعہ جوابات کے ایک دفتر میں تبدیل شدہ نظر آئے گی ؎

وَكَفىٰ بِهٖ شَهِيْدًا!

تو آخر پھر گذشتہ تمام سوالات کا مکمل جواب درجملہ مذکورہ صفات کا حقیقی مرکز کون ہے؟

— وہ ایسا گرامی قدر وجود ہے جو زمانہ کی رسم کے مطابق صرف اتنا ہی نہیں کہ خود کسی مشہور خاندان کا ایک فرد ہے اور بس — بلکہ جس خانوادہ مجد و نجابت کے طفیل دنیا کو شہرۃ و ناموری اور صیت و غلغلہ کا حقیقی مفہوم سمجھ میں آیا لیکن گردش زمانہ نے صدیوں سے اس کے اکابر رجال کے کارناموں کو مدہم اور مضمحل کر دیا تھا۔ وہ شخص مذکورہ خاندان کی طرف سے از سر نو سفیر علم و فضل، نمائندۂ مجد و نجابت، قاصد رشد و ہدایت، داعیٔ اصلاح و تجدید، اور قائد تحریک انقلاب اور صرف مشہور و معروف ہونے کے بجائے خود "مُعَرِّفُ الآبَاءِ وَالأَجْدَاد" — کی صورۃ میں نمودار ہوا، اور اصل کمال بھی یہی ہے کہ انسان کسی کی شہرۃ و فضیلت کے سہارے نامور ہونے کے بجائے خود اپنے اخلاق و اعمال کے ذریعہ اپنے حسب و نسب، آباء و اجداد، اعزہ و احباب نیز اپنی ذات اور جماعۃ کو بھی لازوال،

شہرت و معروفیت کا درجہ عطا کرے اور — لاریب! — کہ ہمارے ممدوح کو بھی مبداءِ فیاض نے انہی اوصاف و خصائص کا مرقع بنا کر بھیجا تھا، جسے اپنے تو جانتے ہی ہیں، مگر بیگانے اپنوں سے کہیں زیادہ اور بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ اور جس کی روح علم و عمل اسکے پیکرِ جسم و مادہ کے متعلق ایک عرب شاعر کی زبان سے مدعیانِ علم و فضیلت کو خاموش دعوتِ مبارزت دے رہی ہے کہ ؎

فالخیلُ واللیلُ والبیداءُ تعرفنی!
والسیفُ والرمحُ والقرطاسُ والقلمُ،

(سواری کے گھوڑے، رات کی ساعتیں اور میدانِ سفر میرے حال سے باخبر ہیں تیر و تلوار مجھے پہچانتے ہیں اور کاغذ و قلم بھی میرے آشنا ہیں؟)

اور اگر معمولی تصرف کے ساتھ اسے یوں پڑھ لیا جائے کہ ؎

ھٰذا الذی تعرفُ البیداءُ وطأتہ،
والعلمُ یعرفہ، والقولُ والقلمُ!

(یہ وہ ذات ہے کہ رزم گاہِ عمل اسکی یلغار سے باخبر ہے، علم اُسے پہچانتا ہے اور خطاب و تحریر اس سے آشنا ہیں!)

تو اور بھی موزوں اور مطابقِ احوال ہو جائیگا جس سے بیان و قلم اور علم و عمل — کے دونوں قابلِ فخر جوہر نمایاں تر ہو جائیں گے ؎

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا —؟
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے!

● — جنکا نام نامی اور اسمِ گرامی ہے سید شرف الدین احمد عطاء اللہ شاہ بخاری

• ولادۃ — یوم جمعہ بوقت سحر ۱۲ ربیع الاول ۱۳۰۹ھ کی چاندرات مطابق ۱۸۹۱ء
• نام — ددھیال کیطرف سے عطاء اللہ — اور ننہال کیجانب سے شرف الدین احمد رکھا گیا
• کنیت — ابو العطایا • خطاب — امیر شریعۃ • تخلص — ندیم — !

• والد ماجد کا نام نامی حضرۃ حافظ سید ضیاء الدین بخاری ابن حضرۃ سید نور الدین بخاری قدس اللہ سرہٗ ۔

• والدہ محترمہ کا اسم گرامی سیدہ فاطمہ اندرابی بنت مولانا حکیم حافظ سید احمد اندرابی نور اللہ مرقدہما — !

• نانی : صاحبہ قطب العالم امام الواصلین والعارفین حضرۃ خواجہ باقی باللہ دہلوی قدس سرہٗ کی نواسی تھیں، جو ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے اثرات ونتائج میں دہلی سے بہار میں پناہ گزینی پر مجبور ہوئیں، اور وہاں سادات اندراب کے ایک نامور فرد سے اُن کا عقد نکاح ہوا ۔

• پر نانا — حضرۃ میر سید عبد السبحان اندرابی رحمۃ اللہ علیہ، ننہال کے مورث اعلےٰ تھے جو کشمیر سے ہندوستان وارد ہوئے اور بہار کے شہر پٹنہ — عظیم آباد میں سکونت اختیار کی ۔ جہاں باطنی شرف ومجد کے علاوہ ظاہری دولۃ وامارۃ میں بھی انہیں ممتاز مقام حاصل ہوا ۔ چنانچہ حوادث زمانہ کی دست برد سے بچی ہوئی ان کی جائداد کا ایک حقیر سا حصہ محلہ خانہ باغ پٹنہ میں ایک عظیم الشان حویلی کی صورۃ میں اب بھی موجود ہے ۔

• اس نجیب الطرفین — ذات گرامی نے بچپن ہی سے علم وفضیلۃ، تہذیب و اخلاق، حسن معاشرہ اور آداب زندگی کے معطر ماحول میں پرورش پائی ۔ پیش نظر تحریر کے

مقصد کے طور پر یہ جاننا مناسب ہوگا کہ حضرتِ ممدوح کی نانی صاحبہ ۔ روحانیت و اخلاق کا منبع ہونے کے ساتھ ساتھ ظاہری اوصافِ حسنہ کا مرقع بھی تھیں، خصوصاً سخن فہمی و زباندانی میں انہیں یدِ طولےٰ حاصل تھا۔ محاورہ کے مطابق دِلّی ۔ کی کوثر میں دھلی ہوئی زبان ان کے نُطق و تکلّم کا زیور تھی۔ چنانچہ ہندوستان کے مشہور شاعر اور اپنے وقت کے استاذِ تغزّل میر سیّد علی محمد شاد عظیم آبادی مرحوم اپنے کلام کو سطحی زبان سے مُبرّیٰ رکھنے اور مستند بنانے کے لئے مفرداتِ الفاظ، محاورات اور ضرب الامثال پُوچھنے، اُن کی تحقیق کرنے اور اُن کی سند لینے کی غرض سے حضرتِ ممدوح کے ننہال سے گہرے تعلّقات اور بے تکلّفی کی بنا پر، محترمۂ موصوفہ رحمہا اللہ ۔ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے، اور ان کی تحسین و تصویب سے مستفید ہوتے تھے۔ خود شاہ صاحب کے نانا سیّد احمد مرحوم خوش الحان حافظ ۔ عالمِ دین، طبیہ کالج لکھنؤ کے مستند حکیمِ حاذق، اور زبان و بیان پر قدرت رکھنے والے ایک خوش گلو نغمہ طراز بھی تھے۔ شاہ صاحب کو شاد مرحوم کی علمی و ادبی محفلوں میں بکثرت بیٹھنے کا موقع ملا، اُن کا کلام اور وقت کے متعدد اہلِ فن کے چیدہ چیدہ اشعار انہیں ازبر تھے۔ مزید برآں گھر میں ماموں ۔ جو کئی بھائی تھے۔ بعض اُن کے ہم عمر اور بعض کبیر السِّن۔ نیز بچپن کے بعض خاص رفیق، اِن سب کی آپس میں محفلِ مشاعرہ جمتی، اور پُرانے علمی گھرانوں کے رواج اور مذاق کے مطابق بیت بازی کا معرکہ برپا ہوتا، چنانچہ اسی بہانہ سے اردو اور فارسی کے مختلف مشہور و معروف اساتذۂ فن کا ذخیرۂ اشعار اِن اہلِ مجلس کے نہاں خانۂ قلب و دماغ میں محفوظ ہوگیا ۔ جس پر ضبط و حفظ، ذہانت و ذکاوت، تعلیم و تعلّم بحث و تکرار، اور مشق و تمرین، نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔ اور ابتدا سے ہی زبان دانی ۔ سخن طرازی، سخن فہمی، بدیہہ گوئی، طلاقتِ لسانی، موزونئ طبع اور شعر گوئی کے ذوق و استعداد نے ان کے دل و دماغ کو اپنا گھر بنالیا، اسی ملکۂ تکلّم، قدرۃ علی البیان

اور استعداد و ذوقِ سخن نے آگے چل کر ان کی خطابت و تقریر کو ایسے چار چاند لگائے کہ بڑے بڑے زبان دان اور اہلِ فہم اُن کے حسنِ انتخاب، بدیہہ گوئی اور سخن طرازی پر داد دئے بغیر نہ رہ سکے، حتیٰ کہ وہی استعداد و ذوق جب اپنی اصلی شکل اور مطلوبہ راستے میں نمودار ہوا تو اس نے دبی دبی چنگاریوں کے خول سے نکل کر کبھی ابھرتے ہوئے شعلوں کا قالب بھی اپنا لیا۔ اور شعر خوانی کے جذبہ نے داعیۂ شعر گوئی کی صورۃ اختیار کر لی۔ عنفوانِ شباب ـــ میں جب کہ تحصیلِ علم جاری تھا اور تقریر و خطابت کا وعظ کی صورۃ میں آغاز ہو چکا تھا۔ مشقِ سخن کے لئے پہلے بھی طبیعت کچھ آمادہ ہو چکی تھی۔ لیکن یہ چیز تبعاً ـــ تھی، اصل مشغلہ اور مصروفیت ـــ تبلیغ و تقریر کا کام تھا۔ بہرکیف اس وادی میں قدم رکھا تو پھر ضابطہ کے مطابق رہبرِ سفر سے آشنائی اور ربط کی قدیم رسم بھی پوری کی گئی۔ اور سب سے پہلے امرتسر کے ایک ذی علم و ادب بزرگ جو معلّم و ادیب اور شاعر نیز ایک باعزّت و متدیّن تاجر بھی تھے یعنی مولانا محمد دین غریب مرحوم ـــ ان سے سلسلۂ تلمّذ قائم کیا گیا، مگر اس سارے عرصۂ تعلیم و تلمّذ میں ایک مصرع طرح پر گرہ لگانے کے سوائے اور کوئی شعری یادگار قائم نہ ہوئی۔ بعد ازاں تحریکِ خلافت میں سرگرم حصّہ لینے کی بنا پر جب ـــ میانوالی جیل میں دو سال تک محبوس رہنا پڑا تو وہاں حضرۃ مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا لقاء اللہ عثمانی پانی پتی، صوفی محمد اقبال مرحوم پانی پتی، جناب آصف علی مرحوم دہلوی، عبداللہ چوڑی والے دہلوی، سالک بٹالوی، اور بابا گوردت سنگھ کوٹی۔ جیسے اہلِ علم و فضل اور اصحابِ ذوق کی شبانہ روز ہم نشینی و بزم آرائی ـــ نے پرانے جذبات اور ولولے پھر بیدار کر دئے۔ وہاں کبھی محفلِ مشاعرہ منعقد ہوتی، نظم و غزل کی صورت میں

کلام پڑھا جاتا اور گرمیں لگائی جاتیں، چنانچہ اس زمانہ کی ادبی یادگار کے طور پر بھی تین چار شعر ہی میسر آئے اور اس کے بعد تو بھی تلیث برس کی ہنگامہ خیز اور طوفان آفریں قومی و سیاسی زندگی میں فرصت و عافیت کے اس نرم و نازک شغل کے لئے نہ کوئی گنجائش پیدا ہو سکی اور نہ بتکلف پیدا کی جا سکی تا آنکہ سنہ ۱۳۶۲ھ - سنہ ۱۹۴۳ء میں مشہور کمیونسٹ شاعر ساحر لدھیانوی کی مشہور نظم قحط بنگال — کے مضمون سے متاثر ہو کر پھر ایک عمدہ شعر موزوں ہوا - اور دو سال تک التواء و تعطّل کی کیفیت طاری رہی البتہ جب مدۃ مدیدہ کی کشمکش کے بعد دو قومی نظریہ اور ملکی وحدۃ کے فکر کی سیاسی ٹکر ناگزیر ہو گئی - اور برطانوی حکومۃ نے سنہ ۱۳۶۴ء - سنہ ۱۹۴۵ء کے وسط میں ملک گیر عام انتخابات منعقد کرانے کا اعلان کر دیا - تو اس زمانہ میں بعض خاص محرکات و عوامل کے زیر اثر احساس و انفعال نے تقریر و خطابۃ کی تندیوں اور جولانیوں کے ساتھ ساتھ ادبیۃ و شعریۃ کی — لطافتوں اور روانیوں میں بھی اپنے بعض حسین و دلفریب اور نادر الوجود نمونے بہم پہنچا دئے - چنانچہ اکثر مدائح، منظومات اور قطعات و اشعار — اسی انقلابی دور کی یادگار — ہیں - جن کی محدود تر اشاعۃ پر بھی اُس وقت کی متعدد مسلمہ ادبی شخصیات اور مقتدر علمی جرائد نے نہایت موزوں الفاظ اور فراخدلانہ انداز میں داد و تحسین کے پھول نچھاور کئے تھے، اور صاحب کلام کی علمی فوقیتہ، وسعۃ مطالعہ، قوۃ استعداد بلندئ سخن، حسنِ ذوق اور کمال فن کا بصدق و خلوص اعتراف کیا تھا - اس مختصر ذخیرہ میں پھر تقسیم ہند کے بعد بھی کچھ اضافہ ہوا ہے - لیکن یہاں کے حالات و حوادث نے حضرۃ ممدوح کے جذبۂ ادب نوازی و سخن طرازی کو اس طرح مضمحل اور افسردہ کر رکھا ہے کہ باوجود قدرے فراغت و فرصت کے بھی ان کی طبع حساس اس طرف مائل نہیں ہوتی - اور ظاہر ہے کہ یہ چیز محض فرصت ہی نہیں بلکہ

اس کے ساتھ امن و سکون اور راحت کی بھی طلبگار ہے۔ اور امن و راحت تو اپنے حقیقی مفہوم کے اعتبار سے مدت سے عنقا ہو چکا ہے!

الغرض —— ! یہ جو کچھ بھی تھا طبیعت کا جوہر اور فطرت کا عکس تھا، تکلف و تصنع کا نمونہ یا کسب اور پیشہ وری کا آئینہ نہیں، بلکہ وہ جذبات جو دینی عقائد، سیاسی افکار اور حوادث و واقعات کے زیر اثر کہیں تقریر و خطبہ میں ظاہر نہیں ہوئے تو انہوں نے اپنے ظہور و نمود کے لئے نثر کے بجائے نظم کا روپ دھار لیا۔ اور بس، اس کے ثبوت کے لئے یہی جاننا کافی ہو گا کہ اس کلام کا بیشتر حصہ سیاسی ہنگامہ آرائی اور مضطربانہ زندگی کے باوجود لاریوں اور گاڑیوں میں سفر کرتے ہوئے موزوں ہوا ہے، اور یہ حالہ شعر گوئی و سخن سازی کے لئے جس قدر مناسب اور جتنی "ممد و معاون" ہو سکتی ہے اہل عقل و ہوش پر مخفی نہیں ؟ —— ورنہ اگر کہیں حضرۃ ممدوح تقریر و خطابت کے ساتھ ساتھ شعر و سخن کو بھی اپنا ایک مستقل مشغلہ بنا لیتے تو حقیقت یہ ہے کہ اس فن میں بھی وقت کے امامِ سخن اور اشعر الشعراء —— شمار ہوتے، کیونکہ ان کی طبیعت میں شاعرانہ ذوق اور حسنِ اداء کے تمام اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے، لیکن بقول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ؎

وَلَوْلَا الشِّعْرُ بِالْعُلَمَآءِ يُزْرِيْ

لَكُنْتُ الْيَوْمَ اَشْعَرَ مِنْ لَبِيْدِ!

(اگر شعر گوئی کا پیشہ علماء دین کیلئے باعثِ تحقیر نہ ٹھیرے تو میں آج لبید بن ربیعہ عامری (رضی اللہ عنہ) سے بڑا شاعر و سخن ور ہوتا)

ایک تو وہ اس فن کو ابناءِ وقت اور زمانہ سازوں کی طرح اپنی شہرۃ و ناموری اور جلبِ زر کا ذریعہ نہیں بنا سکتے تھے، دوسرے یہ کہ اُن کی فطرۃ و صلاحیۃ کے مطابق قدرۃ کاملہ نے چونکہ ان کا انتخاب وعظ و تبلیغ

اور تقریر و خطابت کیلئے ہی کر رکھا تھا، اسلئے بھی وہ شعر گوئی اور سخن طرازی کیلئے مستقل وقت اور فرصت نکال کر اس میں مصروف و مشغول نہیں ہو سکتے تھے، مگر اس سب کچھ کے باوجود بھی اس مختصر سے مجموعہ میں جو اپنی لفظی مقدار اور کتابی ضخامت کے پیشِ نظر ایک تبرک سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک فنکار شاعر کے ضخیم دیوان میں ہونا چاہئے یا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہ کتابچہ اس وقت مدح و نعت، منقبت، نظم، غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ، طنز و تفنن، اور مزاح و ظرافت کے مختلف شہکاروں پر مشتمل ہے جو اپنے شایان شان اور مناسب حال طریق سے سلیقہ مندی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور صاحب کلام کی عوامی خطابت کی طرح ان میں بھی الفاظ کی حسنِ بندش کی قوۃ تخیل کی رفعت، بیان کی لطافۃ، زبان کی پختگی بلاغۃ کا شکوہ، تراکیب کا حسن تشبیہات کی ندرۃ، اور فی الجملہ کلام کی جامعیۃ اور فن کی مہارۃ کے جلوہ ہائے گوناگوں متحرک و رقصاں ہیں! پھر انتہائی اجمال و اختصار کے باوصف توحیدِ ذات و صفات، وحدۃ الشہود یا وحدۃ الوجود، وحی و رسالۃ عصمت و ختم نبوۃ، سیاست دینیہ، حکومۃ الٰہیہ، غیرۃ قومی، حمیۃ ملی، شجاعت ظاہری جرأۃ دینی، حق گوئی و بیباکی، فقر و استغناء، درویشی و قلندری، معرفۃ نفس اور اظہار حقیقۃ جیسے جامع عنوانات اور متنوع مضامین بھی اس کلام بلاغۃ نظام کا طرۂ امتیاز اور زیب و زیور ہیں؟ علاوہ ازیں حضرۃ ممدوح جیسے سراپا مقصد اور ہمہ تن اصول خطیب و سخنور کے اپنے الفاظ ہیں کہ —

"اگر انسان اپنے "ما فی الضمیر" کو بہتر سے بہتر حسین سے حسین، اور مختصر الفاظ میں، اس ترتیب کے ساتھ بیان کرے، کہ اس میں ترنم پیدا ہو جائے تو — یہ "شعر" ہے"۔ ۱

اس میزانِ قول و کلام اور معیارِ شعر و سخن پر اگر خود اُن کے اپنے فرمودات ہی کو تولا اور جانچا جائے تو وہ کلمات شعر و نغمہ کا صحیح مصداق ثابت ہوتے ہیں، اور ان اشعار و نغمات کو موجودہ دور کی اس بحث و تنقید کے لحاظ سے بھی کہ کلام کو ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زندگی کا علمبردار ہونا چاہیے ـــ یہ شرف بدرجۂ کمال حاصل ہے کہ وہ محض صوت و ترنم کے بجائے اصول و مقصد کے پیمانوں اور سانچوں میں ڈھلے ہوئے ہیں ـــ اب ظاہر ہے کہ جیسی زندگی اور اس کے اصول و مقاصد ہوں گے اور جیسا کسی کا ضمیر و باطن اور فکر و عقیدہ ہوگا، اسی قسم کا ادب و شعر بھی اس سے ظہور میں آئیگا، تو پھر جس شخص کی بول چال، وصل و انقطاع، خلق و معاشرۃ، فکر و نظر، عقیدہ و مسلک، قول و عمل غرض اسلام کی دعوۃ و تبلیغ غلبۂ دینِ حق کی تجویز و تحریک اور حریت و انقلاب کے لئے جد و جہد اور سعی و کوشش جس کا اوڑھنا بچھونا بن جائے کیا اس کا مافی الضمیر کسی اصل و مقصد کا حامل، اور اسکی زبانِ شعر و خطابت ـــ زندگی کے صحیح اور اٹل مقتضیات کی ترجمان اور پیغامبر ہو گی یا نہیں ـــ؟ ظاہر ہے اثبات و تائید میں جواب دئے بغیر چارہ کار نہیں؟ تو ثابت ہو گیا کہ حضرت ممدوح کی تمام تر خطابت اور شاعری بھی با اصول و با مقصد اور ایک مکمل انسان یعنی ایک سچے مسلمان کی زندگی کی حرکۃ و حرارۃ کی آئینہ دار ہے کیونکہ دعوۃ و تبلیغ اسلام سے بڑھکر صحیح اور زندگی آمیز کوئی نظریہ نہیں، اور غلبۂ دینِ حق کیلئے حریت طلبی و انقلاب آفرینی کو اپنا وطیرہ بنا لینے سے زیادہ واقعی اور زندگی آموز دنیا میں کوئی مقصد نہیں لہذا بلا شک و بلا ریب اور بلا خوف لومۃ لائم کہا جائیگا، کہ یہ مجموعۂ کلام ـــ اگر ایک طرف فنِ شعر و حکمت پروری کے خوشرنگ اور سدا بہار پھولوں کا گلدستہ ہے تو دوسری جانب با اصول و با مقصد زندگی کے گہرے احساسات کی جیتی جاگتی تصویر اور اٹل مقتضیات کا واقعی ترجمان بھی ہے۔ غرض شعر و نغمہ کے پھولوں کا یہ گلدستہ اور ـــ

حکمت و دعوۃ کے موتیوں کا یہ ہار اہلِ علم و عمل دونوں کے لئے باعث توجہ اور جاذب قلب و نظر ہے! اور کہا جا سکتا ہے کہ ؎

بہارِ عالم حسنش دل و جاں تازہ می دارد
برنگ اربابِ صورۃ را، بہ بو اصحابِ معنی را

○

ح — ہر چند کہ یہ تحریر اپنے ابتدائی عنوان کے مطابق حضرۃ ممدوح کا واقعی تعارف نہیں ہے کیونکہ انکی ذات کسی تبصرہ و تعارف کی محتاج نہیں بلکہ اُن کے دم سے ہزاروں نے شہرۃ و معروفیۃ حاصل کی، اور کسی کے حق میں اُن کی، کی ہوئی تعریف خود مقبولیۃ کی ایک سند — سمجھی جاتی ہے لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں کہ مجھے ایک عظیم المرتبۃ خطیب اور قادر الکلام شاعر و سخنور کے فرمودات پر ایک تعارف نویس اور تبصرہ نگار کی طرح رسمی طور پر کچھ کہہ دینا ہے اور بس! بلکہ معاملہ یہ ہے کہ شخص ممدوح خطیب و شاعر کے علاوہ مجھ جیسے بے بضاعۃ و کم سواد کے ہمہ صفۃ موصوف — اور گرامی قدر — باپ بھی ہیں اور ایسے باپ جو دنیا میں لوگوں کو کم نصیب ہوئے ہیں! اسلئے میں تو ایک ایسی الجھن میں پھنس گیا جس سے خلاصی مشکل تھی — کہ اگر اُن کے بارہ میں جبکہ انہیں کا ایک تحریری کارنامہ بغرض افادہ نشر کیا جا رہا ہے — میں ہی خاموش رہتا ہوں تو یہ چیز اظہارِ حقیقۃ اور شہادۃ واقعہ — کے سلسلہ میں مضر نظر آتی، اور اگر میں خود ہی کچھ کہتا ہوں — تو رسم زمانہ کیمطابق اپنے در مدح خود می گوید یا — پدرم سلطان بود — کے معترضانہ تیر و نشتر سے زخمی کردئے جانے کا خدشہ محسوس ہوتا، لیکن میں نے مستعد ہو کر آخری اور بڑی آزمائشی صورۃ کو عمداً اختیار کر لیا —!

اوّلاً ـــ اسلئے کہ جو کچھ مجھے کہنا اور لکھنا ہے، یہ سب اس حیثیت سے نہیں کہ میں ایک غیر معروف شخص کو منظرِ عام پر لانے کے لئے زورِ قلم صرف کر رہا ہوں کیونکہ یہ صورۃ اکثر ہی پیش بھی آتی ہے جہاں ممدوح قصیدہ گو سے بہر حال کم شہرۃ اور زیادہ اجنبی ہوتا ہے، تو مدح کرنے والا اپنی علمی برتری، اور ناموری کے ذریعہ اس گمنام کو مشہور کر دیتا ہے ـــ بلکہ میرا حال یہ ہے کہ ایک ایسا شخص میرے سامنے اپنے تمام اوصاف و خصائص سمیت موجود ہے، جس کی متنوّع، ہمہ گیر طوفانی اور انقلابی زندگی کا ناقدانہ تجزیہ کرنا میرے کیا سب جاننے اور لکھنے پڑھنے والوں کے لئے حتیٰ کہ خود اس شخص کے لئے باوجود قدرۃ بیان کے ایک مہم سر کرنے سے کم نہیں ـــ جسکی شخصیۃ سے متعلق خیالات و تصورات کے ہجوم نے فکر و بصیرۃ کو حیران اور دم بخود کرکے رکھ دیا ہے، لہذا اس اضطراب اور ہچکچاہٹ کی حالۃ میں بجز اس کے کہ میں صرف اپنے مشاہدات، احساسات، اور تصوّرات کو ایک واقعہ کی طرح صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دوں اور کوئی تعبیر نہیں جو اس مفہوم کو ادا کر دے، کیونکہ حقیقی تعارف و مدح سے میں عاجز ہوں، اسلئے ممکن صورۃ صرف ایک ہے، کہ میں نے حضرۃ ممدوح کو ایک گرامی قدر باپ عظیم خطیب اور بلند شاعر کی حیثیۃ سے جو کچھ دیکھا، پایا اور سمجھا ہے، اُسے حتی المقدور بیان کر دوں، نہ یہ کہ جیسی شخصیۃ ہے اس کے شایانِ شان اور مناسب حال کوئی تعارف اور تبصرہ سپردِ قلم کروں ـــ!

ثانیاً ـــ اسلئے کہ میں نے سوچا جہاں یہ بات ایک لحاظ سے قابلِ غور معلوم ہوتی ہے کہ ایک نامور باپ کی تعریف اولاد ـــ خود نہ کرے، بلکہ اہل نقد و تبصرہ کے حقدار لوگ خود ایسے شخص کو اس کے حالات کے مطابق تعریف و مدح کے پیمانوں سے ناپیں! یا پھر اس کے مخالفین اور مدمقابل اسکے اوصاف و محاسن کا اعتراف کریں ـــ وہیں یہ بات میری عقل و وجدان کے لئے ایک مہمیز بن گئی، کہ اگر ایک مستحق تعریف و منقبۃ باپ ـــ کو اس کی اپنی اولاد شہادۃ واقعہ، اظہارِ حقیقۃ اور تحدیث نعمۃ

کے طور پر خود ہی یاد نہ کرے تو آخر اور کون ہے جو ایسے شخص کو اس کے مناقب و اوصاف کے آئینہ میں صحیح رنگ میں دیکھنے کا خواہشمند ہوگا ـــــ اور بات اصل میں یہ ہے کہ دنیا میں یا تو بے نیازِ تعریف باپ ـــــ کی اولاد اُسے یاد نہیں کرتی، یا پھر ناخلف اور دیمک خوردہ شجرہ ـــــ کی نامزد ذرّیتہ اپنے اصل کو فراموش کرتی ہے، کسی حلال خون اور خلف صحیح ـــــ کے لئے یہ تو ممکن ہی نہیں ہے، کہ وہ اپنے ہی باپ ـــــ یا عام الفاظ میں آباؤ اجداد کے حق میں ان کے شایانِ شان تذکرہ یا کم از کم ضرورۃ کے مطابق تعریف و تبصرہ ـــــ سے دستبردار ہو جائے ـــــ تو ظاہر ہے کہ استدلال کا یہ آخری پہلو ـــــ محض جذباتی ہونے کے بجائے عقل و ہوش ـــــ اور وجدان و بصیرۃ کے لئے ایک قابلِ غور و تدبر مرحلہ ہے، اور ہر اولاد کے لئے اس کے آباء و اجداد کے حق میں ایک ـــــ لائقِ اتباع و تقلید ـــــ اُسوہ ! ؎

وَلِکُلِّ قَومٍ سُنَّۃٌ وَ اِمَامُھَا !

(اور ہر ایک گروہ کا ایک عمل اور ایک قائد ہوتا ہے)

د ـــــ اصل کتاب ـ اور تعارف کے بعد ملحقہ تبصرہ کے پیشِ نظر اس تفصیل سے ہی گھبراہٹ ہو رہی ہے اگرچہ اس سے مفر بھی نہیں تھا ـ کیونکہ تعارف کا عنوان ہی اس تطویل کا اصل باعث ہے ـــــ اس لئے مزید طوالت نہ تو ضابطۃً ہی مناسب ہوگی اور نہ ہی وقت اور یہ جگہ اس کی متحمل ہو سکتی ہے، ورنہ حضرۃ ممدوح کے کلام میں پائے جانے والے اوصاف اور عنوانات و مضامین کے علاوہ ان کے نظریۂ شعر و سخن اور فنی و دینی نقطۂ نظر سے اس کی ضروری تفصیلات میں قارئین کرام کی خدمۃ میں پیش کرتا ! مگر قوی عزم اور پختہ ارادہ نیز موضوع کی وسعۃ کے باوجود میں گذشتہ صفحات میں اصل مقصد کے متعلق کئے ہوئے چند اشارات پر اکتفا کرتے ہوئے تنقید کے فریضہ کو اپنے ایک قابلِ احترام بھائی کے ذمہ عائد کرتا ہوں ـــــ جنکی ذات

موجودہ دور کی مادر پدر آزاد ادبیّۃ اور شاعری کی دنیا میں ۔ فنّ و قانونی اور اخلاق و دیانت ۔ کے امتزاج کا مرقع کہے جانے کی مستحق ہے، جن کی ادبی شہرۃ اور فنی عظمۃ کے ثبوت میں صرف یہی جان لینا کافی ہے کہ وہ آج سے چند برس پہلے مجاھدین احرار اور رجعۃ پسند سیاستہ کے ایک قولی و عملی معرکہ میں مدیر شہیر و شاعر نامور جناب ظفر علی خان جیسے کہنہ مشق اور قادر الکلام بزرگ کو اپنی عمر اور شاعری کے آغاز و شباب میں ہی شکست فاش دے چکے ہیں، خصوصاً "کادیانی دجّال" کی امّۃ مرتدّہ کے تحریری ہزلیات اور تقریری ہفوات کا تو انہوں نے اس جارحانہ انداز اور مزاحمانہ طریق سے کامیاب اور مسلسل جواب دیا ہے، کہ تردید باطل اور تائید حق کے بارہ میں اگر انہیں اس دور کے حسّانُ المِلّۃ ۔ کا خطاب دیدیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا، اور سب سے بڑی بات جو اس سلسلہ میں کہنے کی ہے وہ یہ کہ صاحب موصوف کو حضرۃ امیر شریعۃ مدظلہٗ العالی جہاں انکی ذہانتہ و ذکاوۃ، علم پروری نیز مسلک و مشرب کی لیگانگت کے سبب صحیح معنی میں دینی بھائی بنا چکے ہیں، وہیں ان کے ادبی ذوق اور شعری استعداد و صلاحیۃ کی بناء پر اپنا استاذِ سخن بھی قرار دیتے ہیں، اور اُن کی حالۃ یہ ہے کہ اپنے ظرف و اخلاق کی بناء پر وہ اس رابطہ کو اپنی طرف نسبۃ کرنے سے گریزاں رہتے ہیں، اور حضرۃ امیر شریعۃ اس تعلق کے اظہار و اثبات سے کبھی نہیں چوکتے ۔ اب صاحب موصوف جیسے اُستاذ کیطرف سے حضرۃ امیر شریعۃ جیسے تلمیذ کے حق میں انکار کی کیفیّۃ یہ ہو چکی ہے کہ ؎ نہ میں اُن کو جانوں، نہ وہ مجھ کو جانیں !

اور ان دونوں کے بارہ میں علم سامعین اور نیاز مند قسم کے واقف حال لوگ یہ سوال کرنے پر مجبور ہیں، کہ آخر ؎

ہم پھر یہ اک راز داری سی کیا ہے ؟

بہر حال اس امر کا انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ صاحب موصوف بے شک استاذانہ دسترس کے مالک اور بزم شعر و سخن کے بلند مرتبہ جلیس و ندیم ہیں ۔ میری مراد حضرۃ مولانا العلّامہ طالوت ۔

ملتانی زید فضلہٗ ــــ کی ذات ہے، جو تمام ملک میں بالعموم اور پنجاب میں بالخصوص ایک مسلّمہ ادبی شخصیت ہیں، میرا تعارف تشنہ رہتا ہے اگر حضرت طالوت کا مقدمہ اس کے ساتھ ملحق نہ کیا جائے کیونکہ وہ ایک ادیب و شاعر کے علاوہ ــــ صاحبِ کلام کے قرار دئے ہوئے استاذ کے حسین خیالات اور قابلِ قدر جذبات کا آئینہ ہے، جس میں مختاری جیسے تلمیذ اور طالوت جیسے استاذ کی تصویر صحیح طور پر منعکس نظر آتی ہے، لہٰذا ان سطور کے بعد اس مقدمہ کا مطالعہ مضمون کی تکمیل اور کلام کی حیثیت و نوعیت جاننے کے لیے بہت ضروری اور مناسب حال ہے، پڑھئے اور سر دھنیئے ــــ!

○

الحمد للہ علیٰ احسانہٖ و مزید فضلہٖ ــــ کہ آج اس کی توفیق سے ادارۂ نادیۃ الادب الاسلامی پاکستان (ملتان) کے مطبوعات کی تعداد اس کتابچہ کی اشاعت سے ــــ آٹھ تک پہنچ گئی ہے، پانچ چھ سال کے عرصہ میں کا لعدم وسائل اور تن تنہا کارکردگی کے باوجود ادارہ نے جس قسم کے دینی، علمی، ادبی اور تحقیقی شہ پارے اپنے قدرشناس اور اہلِ فکر و بصیرۃ قارئین معاونین کی خدمت میں بہم پہنچائے ہیں، ادارہ اپنی اس ناچیز مگر فی الواقع اہم خدمت پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے خدا کا شکر ہے کہ آج پھر اسے حسبِ روایات و نظریات شعر و ادب کا ایک فنی مرقع عوام و خواص میں سے صحابہ قدردانوں کی خدمت میں پیش کرنے کا موقع میسر آیا ہے، جو اپنی نوعیت میں خواہ ایک رسمی اقدام کہلائے، لیکن اپنی حیثیت میں ــــ صاحبِ کلام جیسے باکمال اور عبقری الفطرۃ، انسان کے تعلق کی وجہ سے بے مثل اور نادر الوجود ہے کہ ؎

گرچہ خوردیم نسبتیست بزرگ ؟
ذرۂ آفتاب تابانیم !

ہمیں قوی امید اور کامل توقع ہے کہ برِ عظیم ہند و پاکستان کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے

نیاز مندانِ بخاری اور عقیدۃ کیشانِ امیرِ شریعۃ ۔ اس بقامۃ کہنہ لیکن بقیمۃ بہتر
۔ گلدستۂ شعر و ادب اور علم و فن کی سلکِ مروارید کی پیش کش کا اسکے شایانِ شان
بہتر مقدم کریں گے، جس میں ان کے محبوب دینی رہنما اور عظیم قومی خطیب اپنی ہمہ گیر شخصیۃ کے ایک
نئے رنگ اور انوکھے انداز میں جلوہ گر ہیں جہاں معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف ایک ۔ کامیاب واعظ، شعلہ بار
مقرر اور جادو بیان خطیب ہی نہیں بلکہ ایک نغز گو شاعر، جذبات آفریں سحر خوان درفادر الکلام
سخنور بھی ہیں، جسکے جسم و پیکر میں ایک عالِم کی روح، ایک فلسفی کا دماغ، ایک حکیم کی فراستہ،
ایک عارف کی بصیرۃ، ایک شاعر کا دل، ایک غازی کا حوصلہ، ایک مجاہد کا عزم، اور ایک مکمل
انسان یعنی ایک مومن صادق کا ضمیر ۔ دھڑک رہا ہے ۔ دعا ہے کہ رب قدیر اس شاعرِ ملۃ اور
خطیبِ اُمّۃ، اس عظیم انسان، اور صاحبِ بیان کی نواہائے سحر گاہی اور نغمہ ہائے فطرۃ کے زیر و بم سے
ہمارے افکار و اخلاق کی اصلاح و تربیۃ کو وابستہ فرما دے، اور اسکی مثالی زندگی کے نشیب و فراز میں ہمارے عقائد
و اعمال کی استقامۃ و صلاحیۃ کو مقدر کر دے، اور ہم میں سے فرداً و جماعۃً ہر متنفس کو یہ توفیق بخشے کہ وہ
حضرۃ ممدوح کی قیادۃ و رہنمائی میں صراطِ مستقیم ۔ پر گامزن ہو کر خدمۃ دینِ حق کا دنیوی اعزاز
اور نجاۃ و مغفرۃ کی اخروی سعادۃ حاصل کر سکے ۔ کہ اس سلسلۂ تحریر و اشاعۃ اور سعی تبلیغ و وضاحۃ سے مجھ
جیسے کم ہمۃ اور تہی دامن انسان کا حقیقی مقصد اور اصلی مراد یہی ہے اور اسکا حصول ہی دراصل دین و دنیا کی
فلاح و برکۃ کا ضامن ہے ۔

فَتِلْكَ مُنىٰ قَلْبِيْ وَلِيْ بُغْيَتِيْ الَّتِيْ ؟

إِذَا نِلْتُهَا حَازَتْ لِيَ الْفَوْزَ اَجْمَعَا ؛

اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى فَاِنَّا نَسْئَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ ۔ وَالسَّلَامُ

من كل إثم والغنيمة من كل بر والفوز بالجنة والنجاة من النار۔ فيارب صل وسلم و بارك على عبدك ورسولك أفصح العرب والعجم سيد الأولين وخاتم النبيين وخاتمة المرسلين محمد ن الأمي وآله وأصحابه وأزواجه وأتباعه أجمعين برحمتك يا أرحم الراحمين

• آمین! •

راقم السطور بندۂ عاصی و مستغفر

سید ابوذر بخاری غفرلہ الباری ولوالدیہ واحسن الیہما والیہ فی الدنیا والآخرۃ! آمین!

امیر ادارۃ الادب الاسلامی
(پاکستان)

و

مہتمم مدرسہ حریتہ اسلامیہ

ساعة یک ـ شب چہار شنبہ ـ ۳۰ ۵/۴ھ ۷ ۱/۵۵ء ۲۵ ـ ۲۳۴، بٹی شیر خان ـ ملتان شہر ـ!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقدمہ

۱

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جبکہ عرب قبائلی زندگی بسر کرتے تھے، ہر قبیلہ کا ایک شاعر اور ایک خطیب ضرور ہوتا تھا جس قبیلہ میں شاعر یا خطیب نہ ہوتا وہ کم مرتبہ خیال کیا جاتا جس قبیلہ کے شاعر و خطیب بلند مرتبے کے مالک ہوتے وہ دوسرے قبائل سے سربرآوردہ خیال کیا جاتا ــــــ اس لئے شاعر قوم کا دل خیال کیا جاتا تھا، خطیب قوم کی زبان متصوّر ہوتا تھا، اور قبیلے کا سردار قوم کا دماغ، اور نوجوان اسکے دست و بازو شمار کئے جاتے تھے ــــــ دل جہاں نہ ہو وہاں دست و بازو اور دماغ کیا کام دے سکتے ہیں۔ اور زبان نہ ہو تو دل و دماغ کی ترجمانی کیونکر ہو ــــــ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ دل اور زبان کا کام ایک ہی شخصیت سے لیا گیا، اسلام آیا تو قرآن کے سامنے نہ شاعری کا زور باقی رہا، اور نہ خطابت کا چراغ جل سکا ــــــ پھر بھی شعراء اور خطیب باقی رہے۔ مگر اب وہ عصبیت جاہلیہ کو بھڑکانے والے نہیں تھے، بلکہ قرآن کے مبلّغ اور اسلام کے مدافع تھے ــــــ اسلامی فوجوں میں دونوں کا وجود ثابت ہے اور یہ دونوں فوجی نظام کا ایک اہم جزو خیال کئے جاتے تھے ــــــ پھر جب اسلام ہر بلند و پست پر چھا گیا اور اس کی فوجیں فتح ممالک کے ساتھ ساتھ نظم ممالک کا کام بھی کرنے لگیں تو شعر و خطابت نے اپنی اپنی راہیں بدل دیں، شعراء نے مدح و ہجو کی راہ پر چل کر اگرچہ اپنی جیبیں بھر لیں، مگر

بنا دقار کم کر لیا خطیبوں نے قوم کے بگڑتے ہوئے اخلاق کو سدھارنے کا کام اپنے ذمہ لے لیا' اور اپنی عزت اگرچہ پہلے سے زیادہ کر لی مگر ع "چہ خورد بامداد فرزندم" کے مسئلہ پر پہنچ کر ششدر رہ گئے، پھر محض قصاص اور پیشہ ور بن گئے جن کے متعلق ع "چوں بخلوت میروند آں کار دیگر مے کنند" کا فتوےٰ صادر کیا گیا۔ کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی رہے جنہوں نے کما کر کھانے اور حق کہنے کی قسم کھا رکھی تھی، وہ ممبروں پر بھی حق کہتے رہے اور جب ایسا وقت آیا کہ ع بر دار تواں گفت بہ ممبر نتواں گفت، تب بھی انہوں نے حق کہنے سے دریغ نہ کیا ——— جب مشرق و مغرب سے عرب قیادت کا ٹاٹ لپیٹ دیا گیا تو شاعری نے عشقبازی کی رسوائی کو طرۂ امتیاز بنا لیا، اور خطابت غیروں کے کام آنے لگی ع۔ ایں ہم رفت و آں ہم رفت ——— ہر کلیہ میں استثنا ضرور ہوتا ہے، چنانچہ بعض صوفیا اس دور میں بھی مستثنیٰ رہے، جنہوں نے شاعری کو رسوائی سے علیحدہ رکھا، اور خطابت کو قصہ گوئی سے بچا کر اغیار کی دستبرد سے بھی محفوظ رکھا، مگر ان کی حیثیت الشاذ کا لمعدوم سے زیادہ نہ تھی ———

(۲)

برعظیم پاک و ہند میں اسلام گجرات کا ٹھیاواڑ کے راستے سے داخل ہوا' جہاں عرب اپنی تجارت کے سلسلے میں آمد و رفت رکھتے تھے، مگر اس کا نفوذ اس وقت جا کر پورا ہوا جب محمد ابن قاسم سندھ کے راستے سے ملتان و لاہور تک فاتحانہ در آیا۔ پھر جب اسلام کے سیاسی سفیر معین الدین اجمیری ؒ نے دلی، پنجاب اور راجپوتانہ کا دورہ کر کے شہاب الدین غوری کو بلایا تو یہ نفوذ اور بھی بڑھ گیا۔ کچھ دن اجمیری اور غوری کے جانشین مل کر کام کرتے رہے، مگر ایک وقت ایسا بھی آ گیا کہ ان کی راہیں الگ ہو گئیں ——— پھر بھی ایک دوسرے سے اتنا بُعد نہیں تھا کہ اجنبیت کا خیال گذرتا۔ کبھی اجمیری کے جانشین دلی تک چلے جاتے اور کبھی غوری کے جانشین خانقاہوں تک قدم رنجہ فرما لیتے ——— خانقاہوں نے تخت و تاج کی حفاظت کی اور تخت و تاج نے خانقاہوں کو جاگیریں عطا فرمائیں ——— اور دونوں ع من ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو ———

کے کوچہ میں پہنچ کر اپنے اصل مقصد سے دُور ہو گئے ——— خانقاہوں میں تخت و تاج کے خلاف سازشیں شروع ہو گئیں، اور تخت شاہی پر سے اہلِ خانقاہ کی ترغیب و ترہیب کے لئے منصوبے تیار ہونے لگے ——— تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ کی صداقت نے کبھی اہلِ خانقاہ کا ساتھ دیا۔ اور کبھی تاج و تخت کا ——— تا آنکہ مغلِ اعظم نے الحاد کے ساتھ ساز باز کر کے اہلِ خانقاہ کو مارکیٹ بدر کر دیا۔ مگر یہ کام اتنا آسان نہیں تھا مغلِ اعظم کے جانشین نے سرِ ہند میں گھٹنے ٹیک دیئے اور اہلِ خانقاہ ہتھیاروں سے مسلح ہو کر پھر بلند و پست پر چھا گئے ——— اسی زمانہ میں مغرب کے دندان آز کی تیزی کی داستانیں بھی اس برِ عظیم تک پہنچنے لگ گئی تھیں۔ حکمت و طب کے چور دروازے سے گزر کر کچھ لوگوں نے اس برِ عظیم کی نفع بخشی کا جائزہ لیا، تو اسی چور دروازے سے تجارت کی راہیں پیدا کی گئیں، تا آنکہ ——— ایک وقت ایسا آیا، کہ اہلِ خانقاہ تاج و تخت سے بیزار ہو کر بالکل الگ ہو گئے۔ اور تاج و تخت بحیرہ فرنگ کی موجوں میں ہچکولے کھانے لگ گیا۔ موجیں اگرچہ تند و تیز نہیں تھیں مگر تخت کی بوسیدگی اور ناخداؤں کی ہوا ناشناسی کی وجہ سے آخر یہ تخت ایسا غرق ہوا کہ اس کا ایک تختہ بھی کہیں ظاہر نہ ہوا ——— سرنگا پٹم کے پاس اس کا ایک کنارہ ذرا سا ظاہر ہوا ہی تھا اسے نظامِ دکن کی نظر کھا گئی اور —

بیک گردشِ چرخِ نیلوفری • نہ نادر بجا ماند نے نادری

(۳)

تخت و تاج سے مٹنے کے بعد نئے حاکموں نے پہلے تو قانونِ خداوندی کو پورا کیا۔

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا	بادشاہ جب (فاتحانہ) کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں،
وَجَعَلُوْا اَعِزَّةَ اَهْلِهَا اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ	تو اسے برباد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور وہاں کے
يَفْعَلُوْنَ ؕ	غالب لوگوں کو ذلیل بنا دیتے ہیں اور وہ اسی طرح کیا کرتے ہیں

پھر جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ اہلِ خانقاہ جنہوں نے نئے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر مغلِ اعظم کے جانشینوں کو

گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا ان میں ابھی اتنی جان باقی ہے کہ وہ قوم کو پھر میدان میں لا کھڑا کر سکیں گے ــــ
چنانچہ عیار حکمرانوں نے نظامِ خانقاہی ہی میں سے کچھ لوگوں کو ترغیب کے چھکے دے کر اپنا ہمنوا بنا لیا، اور دوسری طرف وہ کام شروع کر دیا جو فرعون نے بنی اسرائیل کے ساتھ کیا تھا ــــ مگر فرعون بنی اسرائیل کے بچوں کو "تلخ چھری" سے ذبح کرتا، اور یہاں قوم کے بچے "میٹھی چھری" سے ذبح ہوتے۔ اور میٹھی چھریاں بنانے کا سب سے بڑا کارخانہ اگرچہ علیگڑھ میں تھا مگر اس کی شاخیں ہر شہر اور قصبے میں موجود تھیں۔ جب بغیر بدنامی مول لیئے قصاب خانوں اور مسلخوں سے زندہ لاشیں برآمد ہوئیں تو ان پر نوازشات کی بارش شروع ہو گئی، جسے دیکھ کر ہر شخص اپنے بچوں کو خود بخود ان مسلخوں میں داخل کرانے لگ گیا، اور اس طرح ان حاکموں کا کام آسان ہو گیا ــــ مگر باوجود اس آسانی کے ان کا دل مطمئن نہ ہوا ــــ اور خطرہ یہ تھا، کہ اہل خانقاہ کا دوسرا حصہ جو ترغیب ترہیب سے بے نیاز تھا۔ برابر اپنے کام میں مصروف تھا۔ اور ہو سکتا تھا کہ ان زندہ لاشوں کے قلوب میں وہ ایمانی حرارت پیدا کر کے ان حکام کے خلاف انہیں استعمال کر لیں ــــ
اس لئے حاکموں نے تہیا کر لیا، کہ جسطرح ان لوگوں کی ظاہری کھال قصاب خانوں میں کھینچ لی گئی ہے۔ کسی طرح ان کے قلوب میں سے ایمانی حرارت کا بھی خاتمہ کر دیا جائے، اور یہ اس صورت میں ممکن تھا جب کہ الحاد کی برودت اس طرح ان کے دلوں میں داخل کر دی جائے کہ ایمان کی گنجائش ہی باقی نہ رہے ــــ
چنانچہ پنجاب کے ضلع گورداسپور میں ایک خاص قسم کے کھیت ایک مخصوص قطعہ زمین پر تیار کیئے گئے، اور وہاں ایک "تجرباتی فارم" بنا کر نئے اصول کے مطابق کاشت کے نئے تجربات کیئے گئے۔ حتےٰ کہ ایک "خود کاشتہ پودا" ایسا نتیجہ خیز ثابت ہوا جس کے استعمال سے حرارت ایمانی کے لئے قلوب میں کوئی گنجائش باقی نہ رہتی تھی۔
اب ملک میں ہر طرف اس فارم کی شاخیں کھول دی گئیں، اور ہر جگہ یہی پودا کاشت ہونے لگا۔ جب ملک کے اندر اس کی پیداوار کافی ہو گئی، اور وہ نفع آور بھی ثابت ہوئی تو یہ مال باہر کی منڈیوں میں بھی

بھیجا جانے لگا۔ عرب، افریقہ اور یورپ کی منڈیوں میں خصوصیت کے ساتھ یہ "مال" بھیجا جاتا تھا۔ یورپ میں تو صرف نمائش کی خاطر کہ دیکھئے، ہندوستان کا مال کس قدر خوبصورت اور نفع بخش ہے اور عرب و افریقہ کی منڈیوں میں استعمال کی خاطر، تاکہ وہاں کے لوگوں کے دلوں سے بھی حرارتِ ایمانی کا خاتمہ کیا جاسکے۔

(۴)

یہ حالات تھے، جب غیرتِ حق کو جوش آیا، اور اس نے سرزمین پاک و ہند میں عرب کے باقیات الصالحات اور عربی آقا (فداہ ابی و امی) کے نام لیواؤں کو ایک شاعر اور ایک خطیب عطا فرمایا۔ تاکہ شاعر اپنے سوز اور خطیب اپنے ساز سے اُن کے دلوں کو گرما کر پھر ان میں حرارتِ ایمانی پیدا کر سکیں۔ خطیب کی جادو بیانی ساتھ نہ ہو تو شاعر کا پیدا کیا ہوا سوز میدان میں کام نہیں دے سکتا، اور اگر شاعر کا سوز نہ ہو تو خطیب کی جادو بیانی اگرچہ اثر تو کرتی ہے مگر اس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا ——— سرد لوہے کو کوٹنے سے آج تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا، البتہ لوہا گرم ہو تو لوہار کے لئے کام آسان ہو جاتا ہے ——— شاعر کا کام قساوت قلبی کو اشعار کی گرمی سے نرم کرنا ہے، اس کے بعد خطیب کا کام شروع ہوتا ہے کہ وہ اس سے کام لے ——— حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا۔ اِنَّ مِنَ الشِّعرِ لَحِکمَۃً وَاِنَّ مِنَ اَلْبَیَانِ لَسِحرًا۔ کچھ اشعار حکمت بھرے ہوتے ہیں، اور کوئی خطابت جادوگری کا کام کرتی ہے ——— اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل خاص سے جب اسلامیانِ پاک و ہند کی اصلاح کے لئے نظرِ عنایت ملتفت فرمائی تو انہیں حکمت و سحر دونوں عطا فرمائے، تاکہ پہلے حکمت زمین تیار کرے اور اس کے بعد جب یہ معلوم ہو کہ ع یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی تو خطیب کی ساحرانہ طاقت بروئے کار آکر قوم سے کام لے ——— آپ کو معلوم ہے کہ حکمت کے علمبردار ہمارے ہاں حکیم الامت علامہ اقبال رحمہ اللہ تھے۔ جنہوں نے اپنی حکیمانہ شاعری سے الحاد زدہ

سنگین قلوب کو موم کی طرح نرم کر دیا اور جنکی شعلہ نوائی نے پاک و ہند کی تاریکیوں میں قندیل کا کام دیا ع ترے لئے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل

اور اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا کا مصداق پیکر خطابت خطیب الامت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری ہیں (مَتَّعَ اللّٰہُ الْمُسْلِمِیْنَ بِطُوْلِ بَقَائِہٖ) جن کی جادو بیانی اپنوں بیگانوں سب کے ہاں مسلّم ہے اور جو "لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف" کا پورا پورا مصداق ہیں۔

(۵)

علامہ اقبال رحمہ اللہ کے حلقۂ اثر میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے ان کے پیغام اور انکی حکمت کی تشریح کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے، کیونکہ یہ کام آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام کا مصداق ہے ہم خرما و ہم ثواب، اچھا کام بھی کرو اور تصنیف و تالیف کے دام بھی پلّے باندھ لو، دام نہ ملے تو شہرت تو کہیں گئی نہیں، مگر بخاری کی خطابت کی تشریح اور ان کے مقاصد کا بیان کچھ آسان کام نہیں ہے، گو ان کے حلقۂ اثر نے جادو بیان خطیب تو پیدا کئے، مگر آج تک انہیں ایک بھی ایسا آدمی نہ مل سکا، جو ان کی ساحری کو صفحات قرطاس پر ثبت کر کے زادِ تاریخ بنا سکتا جس سے آنے والی نسلیں بھی بہرہ اندوز ہو سکتیں اور یہ اسلئے کہ ایک تو یہ کام آسان نہیں اور دوسرے گٹھلیوں کے دام تو الگ رہے یہاں تو آموں کے دام وصول ہونے کی بھی امید موہوم ہے، اور پیٹ میں روٹی یا بدرجۂ آخر خرما کے دو چار دانے نہ پہنچیں تو نرے ثواب کو کوئی اوپر اوڑھے یا نیچے بچھائے؟ اور یہی وجہ ہے کہ آج تک بخاری پر کچھ نہیں لکھا گیا، ورنہ ان کے محاسن برِ عظیم پاک و ہند کی کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے کم نہیں۔

حضرت علامہ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب قدس سرہٗ العزیز شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کی شخصیت سے اہل علم ناواقف نہیں ہیں، آج سے چار سو سال پہلے تک ان کے مرتبہ کا کوئی عالم نہیں اور نہ شاید آج سے چار سو سال بعد تک کوئی پیدا ہو۔

انہوں نے خود علامہ اقبال رحمۃ اللہ اور دوسرے اکابر کے سامنے لاہور میں آپ کو "امیر شریعت" نامزد فرمایا، اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور سب کو آپ کی متابعت کا حکم دیا۔ کیا یہ کچھ کم فضیلت ہے؟

مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت ارضِ پاک و ہند کا بچہ بچہ واقف ہے۔ ان کی خطابت و قیادت دونوں مسلّم الثبوت ہیں، مگر انہوں نے لاہور میں ایک موقع پر شاید دفتر "زمیندار" میں سب کے سامنے شاہ صاحب کے متعلق فرمایا کہ "اس ظالم سے نہ پہلے تقریر کی جا سکتی ہے اور نہ بعد میں، اس کے بعد تقریر کرنے والے کا اثر جمتا نہیں، اور اس سے پہلے جو تقریر کرے اس کے اثر کو یہ آ کر مٹا دیتا ہے"۔

مذہب و سیاست کی دو بڑی شخصیتوں کی رائے کے بعد کسی تیسرے آدمی کی رائے لکھنے کی یہاں نہ گنجائش ہے اور نہ ضرورت، بلکہ میرے نزدیک تو ان آراء کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ ع

آفتاب دلیل آفتاب!

سورج جب نکل آئے تو لوگوں سے کبھی یہ نہیں کہا جاتا کہ لو جی وہ سورج نکل آیا ہے، بلکہ ہر شخص اُسے خود بخود دیکھ لیتا ہے، اور کسی شخص کو اس کے وجود سے انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی، اور تو اور نابینا لوگ بھی اگرچہ دیکھ نہیں سکتے مگر اس کی حرارت کو محسوس کر کے اس کے وجود سے منکر نہیں ہوتے ——— صرف ایک روایتی جانور (اگر اسے جانور کہنا صحیح ہے) یا پرند (اگر اسے پرند کہنا صحیح ہے) کے متعلق مشہور ہے کہ وہ سورج کو دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ اگرچہ اس کی سزا میں سارا دن الٹا لٹکے رہنے کو بادلِ ناخواستہ قبول کیے رکھتا ہے ——— مگر ایسے شپرچشموں کا کوئی علاج بھی تو نہیں ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ٭ چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

"ابن الوقت" کا لفظ آپ نے سُنا ہوگا، محاورۂ اردو میں ابن الوقت اس شخص کو کہا جاتا ہے جو ——— "دَعْ مَعَ الدَّهْرِ كَيْفَمَا دَارَ" پر عمل پیرا ہو، اس کو ہر دیگ کا چمچہ اور ہر تھالی کا بینگن بھی کہتے ہیں، جو آپ کے

ہاں آئے تو آپ کی ہاں میں ہاں ملائے، اور آپ کے دشمنوں کے ہاں جائے تو اُن کی ہاں میں ہاں ملائے۔
ابن الوقت کی ضد ایک اور لفظ ہے "ابو الوقت" جو بالکل اس کے خلاف معنی دیتا ہے، ابو الوقت اس شخص کو کہا جاتا ہے جو صاف صاف اپنی رائے رکھتا ہو، اور دوسروں کی ہاں میں ہاں کبھی نہ ملائے۔

ابو الوقت کے معنی ہیں "وقت پہ چھایا ہوا"۔ ابن الوقت، وقت اور ہوا کا رُخ دیکھتا ہے، مگر ابو الوقت، وقت اور ہوا کو اپنے تابع بنا لیتا ہے۔ ابن الوقت پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہتا رہتا ہے، مگر ابو الوقت، جدھر چاہے پانی کا رُخ موڑ دیتا ہے، گو یہ اصطلاح عام نہیں، مگر اہلِ علم کے ہاں غیر معروف بھی نہیں ——
ہر زمانے میں ہر علم و فن میں صرف ایک ابو الوقت ہوتا ہے، اور باقی سب اس کے تابع و نقال ہوتے ہیں۔
گویا ہر زمانے میں ابو الوقت تو ایک ہوتا ہے، مگر ابن الوقت سینکڑوں ہزاروں ہو سکتے ہیں ——

زمانۂ حال میں شاعری کے ابو الوقت علامہ اقبال مرحوم تھے، اور خطابت کے ابو الوقت حضرت سیّد عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری ہیں۔ —— جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ آج ہر شاعر اپنے الفاظ میں وہ ترکیبیں اور وہ بندشیں لاتا ہے جو علامہ اقبال لایا کرتے تھے، بلکہ مضامین بھی تقریباً وہی لائے جاتے ہیں، اور کوشش یہ کی جاتی ہے کہ لوگ ان کے اور علامہ کے کلام میں تمیز نہ کر سکیں، اور خواہش یہ ہوتی ہے کہ علامہ کے کلام کی طرح اُن کا کلام بھی بلند پایہ اور مقبولِ عام ہو جائے —— اسی طرح، آج ہر واعظ اور خطیب کوشش کرتا ہے کہ وہ بخاری کی طرح قرآن پڑھے، بخاری کی طرح وجد آور الفاظ اور سحر آفرین ترکیبیں استعمال کرے، بخاری کی طرح ترنّم کے ساتھ (اگر میسر ہو، ورنہ بغیر ترنم ہی سہی اور اگر غلط فہمی غالب ہو تو بد آوازی کے ساتھ بھی) اساتذہ کے چیدہ چیدہ اشعار سنائے، بخاری کی طرح تاریخی واقعات سے استناد کرے، بخاری کی طرح شواہد کو واقعات پر چسپاں کرے، بخاری کی طرح قرآنی آیات و الفاظ کے نئے نئے نکات بیان کرے، بخاری کی طرح مجمع کو کبھی کبھی مزاحِ لطیف کے چھینٹوں سے جگائے

اور کبھی ترنّم کی لوریوں سے سُلائے، غرض آج ہر خطیب اور ہر واعظ پر بخاری کا اثر ہے اور وہ ابوالوقت، اور لواور اُن لوگوں پر بھی چھایا ہوا ہے جنہیں علمی فضیلت وکمال کی بنا پر وہ اپنے اساتذہ کے برابر درجہ دیتا ہے ہم نے ایک دو نہیں ایسے کئی ایک بزرگ دیکھے ہیں، جن کا ترنّم واجبی ہے، مگر بخاری بننے کے شوق میں سارے کا سارا وعظ مترنّمانہ انداز میں فرما رہے ہیں، حالانکہ بخاری کا کمال صرف بخاری کے ترنّم میں نہیں، بلکہ اُن کے انداز خطابت میں ہے۔ بغیر قرآن وحدیث پڑھے اور بغیر ایک شعر سنائے بھی بخاری سے کامیاب تقریر سُنی جاتی ہے۔ مگر ابنائے وقت کو (خواہ عملی طور پر وہ آیائے علم ہی کیوں نہ ہو) یہ بات سمجھانا تو بے سُود ہے کہ وہ بخاری کی تقلید نہ کریں، کیونکہ ابنائے وقت کا تو کام ہی تقلید ہے۔

۷

بخاری نہ ہوتے تو زمانہ حال کے اسّی فیصدی بہترین خطیبوں کو فنِ تقریر سے منفی کیا جا سکتا تھا۔ یہ وہ حضرات ہیں جنکی زبانوں پر الفاظ بخاری کے ہیں، اشعار بخاری کے انتخاب کردہ ہیں اور آیات واحادیث تک بخاری کی دی ہوئی ہیں، یہ وہ ہیں جنہیں لفظاً لفظاً بخاری کی تقریریں ازبر ہیں، اور اپنے مقام پر وہ ایسی زنلٹے کی تقریر کر سکتے کہ اگر آپ بخاری کو نہ جانتے ہوں یا ان کی تقریر نہ سُنی ہو تو براہ راست انکی خطابت پر ایمان لے آئیں، ان میں کچھ وہ ہیں جنہیں آپ نقل مطابق اصل کہنے سے بھی باک نہیں کریں گے۔ اور کچھ ایسے ہیں جنہیں بخاری کا پاکٹ ایڈیشن کہا جا سکتا ہے، ان کے علاوہ بہت سے ایسے بھی ہیں جنکی نقل راہم عقل با بید تک بھی رسائی نہیں شعر صحیح نہیں پڑھ سکتے مگر بخاری بننے کے شوق میں غلط شعر ہی جھوم جھوم کر سنائے جارہے ہیں، یہ لوگ اپنی جگہ پر اور سب کچھ ہو سکتے تھے لیکن اگر بخاری نہ ہوتے، تو یہ واعظ یا خطیب ہرگز نہ ہو سکتے، اور یہ نہ سمجھے کہ یہ بخاری کے حافظ (یعنی بخاری کی تقریروں کے حافظ) سب بخاری کے ہمنوا یا ہم ضمیر ہیں، ان میں کی اکثریت بخاری کے مخالف ہے۔ بخاری کے الفاظ، بخاری کے انداز اور بخاری کے منتخب اشعار بخاری کے خلاف

استعمال کرنا یہ لوگ اپنے لئے قابلِ فخر سمجھتے ہیں۔ اپنے حلقۂ اثر میں اپنے اندازِ فکر کے مطابق وہ گویا بخاری کا جواب بننے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن حق بات یہ ہے کہ بخاری نہ ہوتے تو اُن کا وجود بھی موہوم ہوتا۔ آج جس طرح ہر بڑے شاعر کو داعیہ لاحق ہے کہ وہ کسی طرح علامہ اقبال سے بڑھا ہوا مانا جائے اور اس کام کے لئے ترکیبیں مضامین اور اندازِ بیان وہ اقبال ہی کا استعمال کرتا ہے، اسی طرح ہر خطیب بخاری کو پڑھ کر (یعنی اس کی تقریریں سُن کر اس کا اندازِ بیان چُرا کر) بخاری سے بڑھنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ نفسیات کا کوئی ماہر اگر ایسے شاعروں اور خطیبوں کے دِل ٹٹولے تو یقیناً وہ کچھ ایسی دبی دبی خواہشات کو ان کے دلوں سے نکال لائیگا جن میں شاعرِ انقلاب شاعرِ اسلام، خطیبِ اسلام اور خطیبُ الامّت بننے کا شوق پنہاں ہو ــــ اقبال اور بخاری کی بڑائی کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے؟

(۸)

سخنگوئی مشکل ہو یا نہ ہو، سخن فہمی انتہائی مشکل کام ہے۔ آج برِ عظیم پاک و ہند کے کھنڈرات میں گھوم جائیے، آپ کو ہر پُرانی اینٹ کے نیچے ایک شاعر اور ہر گلے سڑے روڑے کے پاس ایک مضمون نگار ضرور مل جائیگا، جو اپنے دعاوی کے لحاظ سے غالب کا جواب اور علامہ اقبال کو اصلاح دینے والوں میں سے ایک ہوگا۔ مگر ان میں ایک فیصدی تو کیا ایک فی ہزار بھی مشکل سے کوئی سخن فہم ہوگا۔ بقول سالک جو لوگ مسلسل دو سطریں اردو کی صحیح نہیں لکھ سکتے، آج وہ سلطان القلم کہلاتے ہیں تو ؎ تا بہ دیگراں چہ رسد؟

مگر اس قحط الرجال کے زمانے میں بھی آپ جب بخاری سے ملیں گے تو پہلی ہی ملاقات آپ کو یقین دلا دیگی کہ ؎

اِبھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

اُن کی سخن فہمی اور سخن شناسی اس حد تک مسلّم ہے کہ مولانا ظفر علی خان، مولانا ابو الکلام آزاد، ــــ عبد المجید سالک اور حضرت پطرس وغیرہ بھی اس کا صرف اعتراف ہی نہیں کرتے، بلکہ یہ لوگ آپ کی سخن فہمی اور بذلہ سنجی کے

قدردانوں میں سے شمار ہوتے ہیں، اور جب بھی موقع میسر ہوتا یا تو یہ لوگ بخاری کی محفل تک پہنچنے کی کوشش کرتے یا بخاری کو اپنے پاس لے جاتے، اور پھر وہ محفل جمتی، جس کی نظیر شاید سلف و خلف میں کہیں نہ مل سکے مگر ـــــ

ع یہ باتیں ہیں تب کی جب آتش جوان تھا

بخاری کی محفل اگرچہ اب بھی جمتی ہے، اور وہ تو سدا بہار پھول ہے کہ کوئی دیکھے یا نہ دیکھے کھلا ہی رہتا ہے، مگر اسکی محفل کی خوشہ چینی کرنے والے اب یا تو میرے جیسے کم سواد طالب علم رہ گئے ہیں۔ یا عوام کالانعام کا وہ گروہ ہے جو اپنی عقیدت کے اظہار کیلئے ہر وقت شاہ صاحب کے گرد جمع رہتا ہے ـــــ گردو گرما گدا و گورستان، کی سرزمین میں لاہور، امرتسر اور دہلی کی شادابیاں کہاں سے پیدا ہو جائیں ۔ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

اور آج بخاری کی شکل میں ؎

داغ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی ٭ اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

۹

ہم جملہ عقیدتمندوں کیطرح، مدت العمر شاہ صاحب کو ایک بے مثال خطیب اور ایک بے نظیر سخن فہم بزرگ سمجھتے رہے، مگر ایک دن بیٹھے بٹھائے دفعۃً ہمیں معلوم ہوا کہ شاہ صاحب شاعر بھی ہیں، اور ندیم تخلص فرماتے ہیں سچ جانیے کہ آسمان پھٹ پڑتا اور ہم اپنی آنکھوں سے فرشتوں کو زمین پر گرتا ہوا دیکھ لیتے تو ہم کو اتنا تعجب نہ ہوتا جتنا یہ سنکر تعجب ہوا، کہ شاہ صاحب شاعری بھی فرماتے ہیں، یہ تعجب اس بنا پر نہیں تھا کہ شعر و سخن کوئی عالم بالا کی چیز تھی اور وہاں تک شاہ صاحب کی رسائی نہیں تھی، بلکہ یہ استعجاب ع ناوک نے ترے صید نہ چھوڑا زمانے میں

کی اقسام میں سے تھا۔ یہ تو ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ سخنگوئی سے سخن فہمی زیادہ مشکل ہے اور شاہ صاحب سخن فہموں کے بھی سردار ہیں تو سخن گوئی ان کے مرتبہ سے فروتر بات ہے، مگر اس فروتر بات میں بھی اس قدر پختگی، بلندی اور چستی ہوگی، اس کا ہمیں گمان تک بھی نہیں تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے شعر گوئی کیطرف عمداً اور ارادۃً توجہ نہیں فرمائی، اور جسطرح ہمیں دفعۃً

معلوم ہوا کہ وہ شاعر ہیں، خود انہیں بھی اچانک واردات کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ سخن فہمی کے ساتھ ساتھ سخن گوئی کے جراثیم بھی ان کے اندر پائے جاتے ہیں، مگر شکر کیجیے کہ بحیثیت فن انہوں نے اسکو اختیار نہیں فرمایا، ورنہ بڑے بڑوں کے نام اُن کی سخنوری کے سامنے "چھو ٹورام" ہو کے رہ جاتے۔ ان کی زندگی بازیگاہِ سیاست میں جس نہج پر گذری اسکے متعلق کبھی میں نے کہا تھا۔

صبحدم ریل میں گذرتی ہے ٭ شب کسی جیل میں گذرتی ہے

عاقبت کی خبر خدا جانے ٭ اب تو اس کھیل میں گذرتی ہے

اور اسے تفنّن نہ خیال فرمایئے بلکہ یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے اپنی خداداد نعمت (خطابت) کے تشکّر میں کراچی سے کلکتہ اور گلگت سے بمبئی تک سارے برّعظیم پاک و ہند میں گاؤں گاؤں، شہر شہر اور کونے کونے کا سفر کر ڈالا، اور ہر جگہ لوگوں کو آزادی و وطن خواہی اور مغربیت سے ایمان و اسلام کو بچا لینے کا درس دیا۔ یہ کام اسقدر وسیع تھا کہ انہیں اس کے سوا کسی دوسری طرف توجہ فرمائی کا موقع ہی نہ مل سکا۔

۱۰

پھر تعجب بالائے تعجب اسوقت ہوا جب یہ معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کے فاضل صاحبزادے حضرت ابوذر بخاری نے موتیوں کے ان بکھرے ہوئے دانوں کو بڑے سلیقہ سے ایک سلک میں پرو کر بازار کساد و فساد میں پیش کرنے کا ارادہ فرمالیا ہے، اور پھر اس مشک نافہ کیلئے عطّار کے فرائض مجھ ہیچمدان و ہیچ میرز کو ادا کرنے ہونگے۔ اب :۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

پہلے تو یہ خیال آیا کہ تعارف میں صرف سعدی کے یہ الفاظ لکھدوں "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" مگر پھر خیال ہوا کہ عطاروں کے بازار میں تو یہ بات کہتے ہوئے کوئی حرج نہیں، اور جس بازار میں حضرت ابوذر اپنا یہ گنجینۂ زر پیش کرنے والے ہیں، وہاں ۔

شناسا نہیں کوئی بھی اس ہنر کا

پھر اسکے ساتھ خطرہ یہ بھی ہے کہ کچھ کہنے کیساتھ کہنے والے کا بھرم بھی کھلتا ہے، شاہ صاحب فرمائیں گے ۔

شعر مرا بمدرسہ کہ بُرد ؟ اور اہلِ نظر کہیں گے : سخن فہمیٔ عالمِ بالا معلوم شد! ــــ بہت سوچا، اصطلاحات کا سہارا

لینے کو جی چاہا اور معاً غالبؔ کا شعر دماغ میں گھومنے لگا:۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ، * بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

دل کو ایک گونہ تسلّی ہوئی اور شاہ صاحب کے کلام کو دیکھنے بیٹھ گیا، کہ اب بادہ و ساغر کی اوٹ میں بہت کچھ لکھ لو نگا، ورق الٹا نظر ڈالی تو سب سے پہلے شاہ صاحب کے اس شعر پر جا پڑی ۔

گر ہو دوائے عشق کی تلخی، نصیبِ عقل * بنتی ہے پھر تو بادہ و ساغر کہے بغیر

پڑھتے ہی سر پکڑ کر بیٹھ گیا، اصطلاحات کا سہارا ھَبَاءً مَّنْثُوْرًا ہو گیا، اور ضمیر نے کہا: اب کہو۔ اور میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ غالبؔ کے بعد غالبؔ کی زمینوں میں پہلے تو بہت کم لکھا گیا اور تھوڑا بہت جو لکھا گیا وہ عموماً کامیاب نہیں ہی "جواب آں غزل" کا دور غالبؔ کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ ایں جواب آں غزل غالبؔ کہ صائب گفتہ است لیکن اگر شاہ صاحب اس شعر کے جواب کی بجائے 'جواب آں غزل' لکھ ڈالتے تو کیا کامیاب نہ ہوتے؟

(۱۱)

دوسرے صفحے پر نگاہ پڑی تو فارسی کی ایک نعت سامنے آگئی جس کا مطلع ہے ۔

ہزار صبح بہار از نگاہ مے چکدش * جنوں ز پیچشِ زلفِ سیاہ مے چکدش

مطلع پڑھتے ہی ایک بہت پرانا واقعہ ذہن پر چھا گیا' اور دل نے گواہی دی کہ یقیناً یہ نعت اس واقعہ کے لگ بھگ ہوئی ہوگی' واقعہ یہ ہے کہ ایک بار میں نے شاہ صاحب کی ایک تقریر سُنی' یوں تو ہر تقریر خطابت کا شاہکار ہوتی ہے' مگر اس تقریر کا رنگ ہی کچھ اور تھا' تقریر تقریباً ساری رات جاری رہی' مگر ہزاروں کے مجمع میں سے ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جسے کوئی داعیہ تقریر میں سے اٹھا کے لے گیا ہو' شاہ صاحب کا چہرہ جلال و جمال کا مرقع بنا ہوا بجلی کی روشنی میں آفتاب کی طرح چمک رہا تھا' مجھے اس موقع پر اپنے کسی استاد کی رباعی یاد آگئی ۔

از سخن شہد ناب مے چکدش * وز تبسم گلاب مے چکدش
مے تواں گفت کز حرارتِ مے * از جبیں آفتاب مے چکدش

میں نے ایک لفظ کی تبدیلی سے اسے شاہ صاحب پر چسپاں کر دیا:۔

از سخن شہد ناب مے چکدش ❖ وز تبسم گلاب مے چکدش

مے تواں گفت کز حرارتِ وعظ ❖ از جبیں آفتاب مے چکدش

اور پاس بیٹھے ہوئے ایک دوست کو سنا دی، وہ تڑپ اٹھا، بار بار رباعی کے مصرعے دہراتا اور شاہ صاحب کو دیکھتا۔ بعد میں یہ یاد نہیں کہ میں نے یہ رباعی خود یا اس دوست نے شاہ صاحب کو سنائی، اگرچہ آپ نے ہماری اصلاح تو قبول نہ فرمائی۔ مگر رباعی کو بہت پسند فرمایا، لکھلی، اپنی عادت کے مطابق جھوم جھوم کر کئی بار سنائی، ہمارے لئے سب سے بڑی خوشی اس بات کی تھی، کہ لو جی! ایک چیز تو ہم بھی ایسی نکال لائے جو اب تک شاہ صاحب کے ذخیرۂ انتخاب میں نہیں تھی، ورنہ عموماً یہ ہوا، کہ اُن کی محفل میں کوئی شعر پیش کر دو تو اس کے ساتھ کے دو تین شعر اور سنا ڈالتے ہیں، اور دل نے اِبتہاجاً یہ کہا کہ اس رباعی کے ساتھ ساتھ اب تمہارا نام بھی شاہ صاحب کے دل میں محفوظ ہو گیا، اتنے سے تقرب پر بھی اس قدر نشہ چھا گیا کہ بس کچھ نہ پوچھیے۔

ع بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس است

مگر یہ بات ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ اس رباعی کا کچھ جواب بھی ہو سکتا ہے اور وہ بھی اتنا عمدہ اور بلند پایہ کہ کسی بڑے سے بڑے سخن فہم کے سامنے یہ نعت پڑھ جائیے اور پوچھیے کہ یہ کس کا کلام ہو سکتا ہے تو جواب یہی ملیگا کہ کسی پرانے استاد کا کلام ہے، سبحان اللہ! دیکھئے تو سہی! ؎

چمن چمن گل و نسریں ز عکسِ رُخ ریزد
سد سد گل خنداں ز راہ مے چکدش

خندۂ نمکیں اور چشم سیاہ کی فتنہ انگیزیاں ملاحظہ ہوں، الحفیظ و الامان!

چہ شورہاست بجانم ز خندۂ نمکیں ❖ چہ فتنہ ہا کہ ز چشم سیاہ مے چکدش

صفاتِ حق کی جلوہ نمائی کا بیان آپ نے بہت پڑھا ہو گا، مگر ذات و صفات کے شاہد اور گواہ آپ نے بہت کم دیکھے ہوں گے ؎

چہ گفتگو چہ تبسم شہادتے بحدوث ❖ ز نور چہرہ قدم را گواہ مے چکدش

اس نعت کے ساتھ ساتھ یہ نعت بھی ملاحظہ فرمائیے، اور ہو سکے تو سخن فہموں کے ہاں اسے جامی علیہ الرحمۃ کیطرف منسوب کر کے سنا دیجئے، انشاء اللہ ان میں سے کوئی ایک بھی آپ سے یہ نہیں کہیگا کہ یہ نعت جامی کی نہیں ہو سکتی !

لولاک ذرہ ز جہانِ محمدؐ است — سبحان من یراہ چہ شانِ محمدؐ است
سیپارۂ کلامِ الٰہی خدا گواہ — آں ہم عبارتے ز زبانِ محمدؐ است
نازد بنامِ پاک محمدؐ کلامِ پاک — نازم بآں کلام کہ جانِ محمدؐ است
توحید را کہ نقطۂ پرکارِ دین ماست — دانی؟ کہ نکتۂ ز بیانِ محمدؐ است

وہی جامی کا سوز و گداز، وہی بیان کی پختگی و شستگی، وہی انداز و طرزِ بیان، کون سی چیز ایسی ہے جو جامی کے ہاں ہو اور یہاں نہ ہو؟ ــــ وحدت الوجود کا بیان شاہ صاحب کی زبانی سنئے ؎

وحدت بوجد و حالتِ کثرت در آمدہ — حرکت بجلوہ، جلوہ بحرکت در آمدہ
موسیٰ و طور و وادیٔ ایمن، حرا، حرم — ہر جا کہ دیدہ ایست، بحیرت در آمدہ

یہ وہ جاہلانہ وحدت الوجود نہیں، جہاں عیسائیوں کیطرح "تین میں ایک، ایک میں تین" کی بجائے "دو میں ایک اور ایک میں دو" یا "ایک میں سب اور سب میں ایک" کہا جاتا ہے، بلکہ یہ وہ عالمانہ وحدت الوجود ہے، نہ جسکے سمجھنے میں دقت پیش آئے نہ جسے ماننے میں کوئی امر مانع ہو، وحدت کو وجد آیا تو اس نے اپنی صفات کے مظاہر کو پھیلا دیا، ذات نے صفات کی جلوہ نمائی کی، اور جلوہ ذات متحرک ہوا، دیدۂ بینا جہاں جہاں بھی وہ حیران رہ گئی، اردو میں وحدت الوجود کا مسئلہ آپ نے صرف ایک شعر میں بیان فرمایا ہے، زبان و بیان دیکھئے کسقدر صاف اور تعبیر کتنی دلکش ہے!

ذروں سے تا بہ مہر، ستاروں سے تا چمن — عکسِ جمالِ یار کی تابندگی ہے دوست !

شاہ صاحب کی چار پسندیدہ چیزیں ملاحظہ ہوں :ـ

بخت اگر رسا شود، دست دہد بکوئے خویش — از نگہ من برے لالہ رخے نکوئے خویش
باغ و بہار مانند عیش بعینہ کہ جنت النعیم — روئے خوش است و خوئے خوش بوئے خوش و گلوئے خوش

غنیمت کنجاہی نے اپنی مثنوی میں پنجاب کی تصویر کشی کی ہے اور شاہ صاحب نے اس تصویر کا دوسرا رخ اسی زمین میں پیش کیا، دونوں ساتھ ساتھ ملاحظہ ہوں :-

غنیمت :

ندیدم کشورے غارت گر تاب
بہ خوبی ہائے حسن آباد پنجاب
چہ پنجاب انتخاب ہفت کشور
قسم خوردہ بخاکش آبِ کوثر
فضائے نشۂ ہستی ہوایش
زمینے کاسمانہا خاک پایش
بنائے کعبۂ دلہا زحت کش
عروج نشۂ معنی ز تاکش
غبارش آب و رنگ چہرۂ گل
گیاہش دلربائے زلف سنبل
بہر جا سبزہ از خاکش دمیدہ
رخ خوباں بہ پشتش خط کشیدہ
زلالش بادہ سازِ مستیٔ عشق
نسیمش روح بخش ہستیٔ عشق
گلش بر خاک ہر جا سایہ انداخت
زمیں از آتشِ یاقوت بگداخت
بہ خاکش سایۂ پرہائے بلبل
جواب یک چمن خندیدن گل
شفق سرمایۂ چشم از دیدن گل
چمن ساماں نگہ از چیدن گل
ز شوق آں کہ تا آمد بہ پنجاب
دراں گشتہ چھدرہ میشود آب
حناک آنکس کہ در ہنگام سرما
دریں گلشن بود گرم تماشا

شاہ صاحب

ندیدم کشورے مردود و مرتاب
بشومیہائے کفر آباد پنجاب !
چہ ملکے ننگ و عار ہفت کشور
ز شرق و غرب بادش خاک بر سر
خمیر طینتش مردم کشیہا،
ز قتل مسلمش باشد خوشیہا،
چہ پیرانش مریدانِ فرنگی،
لقب کافور و ذاتِ پاک زنگی
ز نواب و رئیسانش چہ پرسی
سگ و سگ زادگان کرسی بکرسی
چناں فرزندِ ناہموار زاید،
کہ از حرفیتش برتر نیاید !
چکد از لالہ اش خونِ مسلماں
از و نالاں حجاز و مصر و ایراں
جوانانش غلامانِ فرنگی
پناہِ شان بد امانِ فرنگی
چہ پنجاب آں فرنگی را معسکر
معسکر را غلام احمد پیمبر
ضلالت را پیمبر ہست پنجاب
فرنگی را معسکر ہست پنجاب
فضائش کفر ریز و کفر بیز است
بآئینِ الٰہی در ستیز است
زمینِ فتنہ زائے فتنہ خیزے
کہ شیطاں ہمش پالش سجدہ ریزے

دونوں رُخ کسقدر صحیح اور درست ہیں، غنیمت ہے جغرافیائی اور عمرانی رُخ کا جائزہ لیا ہے اور شاہ صاحب نے پنجاب کے اس زمانے کا سیاسی رُخ دکھایا ہے جب انگریز یہاں قابض و حاکم تھا، دونوں نظمیں عنقریب تاریخ کا باب بننے والی ہیں اور مستقبل کا مؤرخ بتلائیگا کہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر کسقدر صحیح منظر کشی کرتی ہیں۔

(۱۴)

چند نظمیں اردو میں اکبر کے رنگ کی بھی موجود ہیں جن میں مزاح اور تفنن ہے اور انہیں پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر شاہ صاحب خارزارِ سیاست سے دامن نہ الجھا لیتے تو موجودہ وقت میں اکبر کے صحیح جانشین ہوتے اور جب اتنا اور اہیں اضافہ ہو جائے کہ ان کی اکثر نظمیں فی البدیہہ کہی ہوئی ہیں تو اور بھی ان کی قدر بڑھ جاتی ہے۔ یہ یاد رہے کہ غالب کیطرح شاہ صاحب بھی یہ کہنے میں حق بجانب ہیں ۔ کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

نہ یہ اشعار اس بنا پر انہوں نے لکھے ہیں کہ واقعی وہ شعر لکھ رہے ہیں اور نہ فن کو انہوں نے کبھی اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ ان کی حیثیت محض تبرکات اور تاریخ کے گم ہو جانے والے اوراق کیلئے صرف "یادداشت" کی ہے اور بس!

(۱۵)

خداداد خطابت میں جو کام شاہ صاحب عمر بھر کرتے رہے اس کا خلاصہ دو باتوں میں پیش کیا جا سکتا ہے:

۱۔ حضور خواجۂ دوسرا (بِاَبِیْ اَنْتَ هُوَ وَاُمَّهَاتِنَا) کی مدح و ثنا ۲۔ اور حضور کے دشمنوں سے دائمی نہ ختم ہونیوالا جھگڑا۔ شاہ صاحب کی شاعری کا سرمایہ بھی یہی دو باتیں ہیں، اور یہ آفتاب کو چراغ دکھانے کا سلسلہ میں آپکے چند نعتیہ نشتروں کو پیش کر کے ختم کرنا چاہتا ہوں، تاکہ آپ براہِ راست نورِ آفتاب سے مستنیر ہو سکیں، چراغ تلے تو آپ کو معلوم ہے ہمیشہ اندھیرا ہی ہوتا ہے اور دیر تک اندھیرے میں بھٹکنا بھی کچھ بھلے لوگوں کا کام نہیں۔

نعت کا مطلع ملاحظہ فرمائیں۔

چہ جلوہ ایست کہ آسودہ در برِ خاک است + کہ ذرہ ذرہ طرب ریز و لبس طربناک است

دوسرے مطلع کی بلندی دیکھئے :

بیا کہ با تو سخنہا ز حرف لولاک است ٭ بیا کہ با تو حکایت ز قدرِ افلاک است

نعت گو شاعروں کے ہاں حدیث لولاک لما خلقت الافلاک کا بیان عام ہے اور ہر شخص حضور کی مدح و ثنا میں اس کا ذکر کرتا ہے، مگر کسی نے آج تک اس کی یوں تجزی نہیں کی کہ اللہ تعالےٰ نے ما خلقت الارض نہیں فرمایا — بلکہ ما خلقت الافلاک فرمایا ہے اور اس میں کیا نکتہ ہے؟ اگر یہ تجزی پہلے معہود ہوتی تو یہ مطلع تھا، مگر چونکہ یہ کام پہلے پہل آپ نے کیا ہے اسلئے دوسرے مطلع سے پہلے ایک شعر میں اس طرح متوجہ فرماتے ہیں، کہ :- ؎

نگفت خالقِ مطلق کہ ما خلقتُ الارض ٭ مقامِ فکر و تامل، حدیث لولاک است

اس شعر کے بعد ذرا پھر شاہ صاحب کا مطلع ثانی پڑھ کر دیکھئے، تاکہ آپ "قدرِ افلاک" کی قدر پہچان سکیں۔ بیشک افلاک کی قدر بہت بڑی ہے۔ مگر اب زمین کی قدر کی افزائش بھی قابلِ غور ہے ؎

مقام و منزلِ قرآن و انبیاء گردید! ٭ بہ مشتِ خاک بنازم چہ رتبۂ خاک است

سبحان اللہ ؎

زمیں کو اس ترقی پر فلک سے داد ملتی ہے
فلک کیا عرش باری سے مبارکباد ملتی ہے!

طالوت

۲۲/۴/۷۴ء	یوم	
۱۹/۱۲/۵۴ء	یکشنبہ	ملتان

در حلقهٔ جعد نیم تابش
مشاطه شکست شانه ها را

{نظیریؔ}

صلی الله تعالیٰ علیٰ اوّل الخلق نورًا،

وخاتم الانبیاء نبوّةً و احسن الناس وجهًا • و الطفهم طبیعتًا • والینهم عریکتًا و اجملهم خلقًا • سید ولد آدم • سیدنا و مولٰنا — محمد — و اٰلہٖ و اصحابہٖ و ازواجہٖ و اتباعہٖ و بارک و سلّم اجمعین !—

اِنتساب

شاعرِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!

سیّدنا **حسّان بن ثابت** انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کے حسبِ ذیل دو شعروں کے توسط سے کہ ؎

وَاَحْسَنُ مِنْکَ لَمْ تَرَقَطُّ عَیْنِی!
وَاَجْمَلُ مِنْکَ لَمْ تَلِدِ النِّسَآءُ!
خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِّنْ کُلِّ عَیْبٍ!
کَاَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَآءُ!

بامیدِ ثواب انہی کی رُوح کے نام اپنی نعتوں کے مختصر مجموعہ کو منسوب کرتا ہوں ؎
گر قبول افتد زہے عزّ و شرف!

بخاری

ا ـــــ ★

وُہ آنکھوں میں مَوجُود اور چشم حیراں؟
اِدھر ڈھونڈتی ہے اُدھر ڈھونڈتی ہے!"

"شانِ وُرُود" ـــــ اِس کے متعلق خود فرمایا ـــ!

• زمانۂ تعلیم میں ـ سنہ تو اب یاد نہیں رہا (یعنی سنہ ۱۳۳۲ھ ـ سنہ ۱۹۱۳ء سے لے کر سنہ ۱۳۳۸ھ ـ سنہ ۱۹۱۹ء کے درمیانی عرصہ میں) سب سے پہلے میں نے مولوی محمد دین صاحب غریبؔ امرتسری مرحوم کی شاگردی کی ـ وہ کوچہ خراسیاں (امرتسر) میں رہتے تھے ـ مَیں اُن کے پاس وہیں اُن کے مکان پر جایا کرتا تھا ـ انہوں نے مجھے مصرع طرح دیا ؎ "اِدھر ڈھونڈتی ہے اُدھر ڈھونڈتی ہے"
اور کہا کہ شعر بنا کر لاؤ ـ اِس پر میں نے مصرع لگایا ؎

وُہ آنکھوں میں موجود اور چشم حیراں!

دوسرے دن میں نے جا کر کہا کہ ایک ہی مصرع لگا کر لایا ہوں ـ سُن کر پھڑک اٹھے اور بہت داد دی!"

۲ — ★

اپنے ہی چند تنکوں کی یہ تیلیاں نہ ہوں؟
"دھڑکے ہے دل قفس میں غمِ آشیاں سے"

شانِ ورود —— اس کے متعلق خود فرمایا —— !

سنہ ۱۳۴۱ھ سنہ ۱۹۲۲ء کی بات ہے، غالباً سردیوں کا موسم تھا۔ میانوالی جیل میں مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ آصف (مرحوم) سالک، عبداللطیف عارف گجراتی۔ بابا گوردت سنگھ کوی، مولوی لقاء اللہ، صوفی اقبال (مرحوم) مولوی محمد عبداللہ چوڑی والے، عبدالرحیم عاجز (مرحوم) حاجی مظفر علی (مرحوم)، خواجہ بہار الدین حیدرآبادی، اختر علی خان، راجہ غلام قادر، اور مولوی روشن دین جو غالباً سیالکوٹ کے تھے۔ (یہ) اور بہت سے آدمی تھے، جن سے محفل مشاعرہ سجی تھی — (چنانچہ) — مسٹر آصف علی مرحوم نے یہ مصرع (بطور طرح) دیا تھا ؎

دھڑکے ہے دل قفس میں غمِ آشیاں سے

زمین کچھ بے معنی سی اور مصرع بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ خیر رات ہوئی تو میں اپنی کوٹھڑی کی چھت کی

کڑیاں دیکھتا رہا اور پھر یہ گرہ لگائی ؎

"اپنے ہی چند تنکوں کی یہ تیلیاں نہ ہوں"

کیونکہ تیلیاں تنکوں سے ہی بنائی جاتی ہیں اور وہی یہ پنجرے میں لگی ہیں — میں اس سوچ میں پڑ گیا، کہ ملک ہمارا، زمین ہماری، اینٹیں ہماری، لوہا ہمارا، اور جیل خانے بھی ہمارے ہی لئے ہیں؛ تو میرا خیال اسطرف گیا کہ یہ مصرع جو کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہی اسباب ذرائع اور دولت کو ہمارے لئے جیل بنا کر رکھ دیا گیا ہے، تو میں نے کہا کہ دل کی دھڑکن جو غم آشیاں سے پیدا ہوئی تھیں وہ اسی سبب سے پیدا ہوئی ہو، کہ اِس قفس میں بھی میرے ہی آشیانے کے تنکوں کی کچھ تیلیاں لگا دی گئی ہوں، جیسے کہ ہماری جیل میں ہمارے ہی ملک کی مٹی، اینٹیں، لوہا اور لکڑی لگائی گئی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اضطراب کی اصل وجہ قفس میں بھی آشیانہ ہی ہے۔ اس جیل سے ہم ۱۳۴۲ھ اکتوبر ۱۹۲۳ء میں رہا ہوئے تھے"!

● — اس پر راقم الحروف نے عرض کیا کہ مجھے تو یہ شعر کچھ اس طرح یاد تھا۔ جیسا کہ عزیزہ ہمشیرہ نے بیان کیا کہ ؎

گر اپنے ہی قفس کی یہ چند تیلیاں نہ ہوں
غم آشیاں ستائے مجھے قید خانے میں

تو فرمانے لگے کہ شعر وہی ہے جو میں نے بتایا — میں نے عرض کیا گو آپ نے تو یہ گرہ نہیں لگائی اور نہ ہی مصرع طرح اس شعر کا جزء ہے لیکن ایک معنی تو اس شعر میں بھی پیدا ہو گئے ہیں — یہ بھی لطیفہ ہی سہی کہ آپ نے ایک مفہوم کو ادا کیا، اور آپ کی بیٹی سے جب میں نے اندراج کے لئے پوچھا تو اس نے بظاہر اپنی یادداشت کے طور پر، اور درحقیقۃً ایک دوسرے اور نئے مفہوم پر مشتمل ایک نیا شعر پڑھ کر سنا دیا — تو گویا اب دو متضاد مفہوم کے حامل مگر ایک ہی موضوع سے متعلق دو شعر یہیں باپ بیٹی سے حاصل ہو گئے — ہنسکر فرمانے لگے "بات کچھ ایسی ہی ہے، شعر بُرا نہیں — لیکن معنی وہ نہیں — بلکہ بالکل برعکس ہے — پہلے میں اضطراب کا سبب بتایا گیا ہے اور اسمیں سکون اور اطمینان کا — خیر بہرحال شعر یہ بھی اچھا ہے"۔ اس لحاظ سے یہ بات قابل داد ہے کہ عزیزہ ہمشیرہ نے محض ادائے مفہوم کے خیال سے جس شعر کو بداہۃً اور ارتجالاً یہ سمجھکر پڑھا کہ ابا جی مدظلہ کا مکمل کردہ ہے، وہ دراصل عزیزہ کی اپنی فکری تراوش اور موزونئ طبع کا عمدہ نمونہ تھا۔ فللہ الحمد والمنۃ۔

۳ ——— ★

شیخ صاحب ہمیں بندوں کی ادا، تو دکھلائیں؟
پھر بتائیں ہمیں بندے سے خدا ہو جانا!

○

شانِ ورود ——— اس کے متعلق خود فرمایا:—

" (مولٰنا غریب امرتسری مرحوم کے بعد) پھر سالک کو میں نے استاد بنایا۔ تو اس نے اِس ردیف میں لکھنے کو کہا:—

اِس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا؟

تو میں نے لکھا:—

شیخ صاحب ہمیں بندوں کی ادا، تو دکھلائیں؟
پھر بتائیں ہمیں بندے سے خدا ہو جانا!

یہ ۱۳۴۱ھ۔ ۱۹۲۲ء (میانوالی جیل) کی بات ہے"——— !

۴ ——— ★

حماقت کی حد ہے کہ سُولی پہ چڑھ کر
سمجھتا ہے بندہ خُدا ہو گیا مَیں !

○

شانِ وُرُود ——— اِس کے متعلق خود فرمایا —— !

" اِنہی دِلوں کی بات ہے (تحریکِ خلافت میں قید شدہ) رضا کار مل کر گا رہے تھے ۔ ان میں مرحوم[1]
حاجی مظفر بھی شامل تھے ، تو مجھے اس قسم کی آوازیں آئیں . کہ ؎

فنا ہو گیا میں ، خُدا ہو گیا میں ؟

غالبًا منصُور (علیہ الرّحمۃ) کے متعلق ہی نظم تھی ۔ (مجھ سے خصوصی خطاب کرتے ہوئے
ایک سوال کے جواب میں فرمایا) " منصوری " لوگ سُن کر کہیں ناراض نہ ہو جائیں ،

---

[1] ۔ امرتسر کے مشہور درکر اور حجاج کے ایجنٹ حاجی مظفر علی مرحوم جو مورخہ ۱ ۱۳۷۷ھ مطابق ۲۸ ۱۱ ۵۷ء شب دو شنبہ کو ملتان میں اچانک انتقال فرما گئے ۔

بات تو دراصل انہیں کی ہے ۔ تم دوسری طرف عیسائیوں پہ لگا لو ـــــ بہر حال میں نے سُن کر فوراً کہا ـــ یہ اچھا خدا ہے ۔ جسے خود بندوں نے ہی خدا بنایا ، اور خود ہی پکڑ کر سُولی پہ چڑھا دیا ۔ ابھی بھی وہ بندہ (لوگوں کی مشہور کردہ روایات کے مطابق) اپنے کو خدا سمجھے تو پھر حماقت کی انتہا نہیں تو اور کیا ہے ۔؟ اور وہیں شعر لکھ دیا (پہلا مصرع ذرا بے ساختہ تھا ۔ اِس میں مناسب ترمیم کرتے ہوئے ارتجالاً فرمایا ۔ اسے) اب یوں لکھ لو ؎

حماقت کی حد ہے کہ سُولی پہ چڑھ کر؟
سمجھتا ہے بندہ خدا ہو گیا میں! "

---

۵ ——— ★

دار کے حقدار کو اور قید سہ سالہ ملے ؟
ہائے قسمت مشکل آساں ہوتے ہوتے رہ گئی !

○

شانِ ورود ——— اسکے متعلق خود فرمایا —!

"اصف علی مرحوم نے (۱۳۴۱ھ ۔ ۱۹۲۲ء) میانوالی جیل میں مجھ سے کہا۔ کہ جب مولنا محمد علی جوہر مرحوم کو نظربندی کا حکم ملا تو انہوں نے اس موقع پر یہ کہا تھا۔ کہ ؎

مستحق دار کو حکم نظربندی ملا! ٭ کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

تو میں نے اس پر یوں لکھا۔ کہ ؎

دار کے حقدار کو اور قید سہ سالہ ملے؟ ٭ ہائے قسمت مشکل آساں ہوتے ہوتے رہ گئی "

——— یاد رہے کہ حضرۃ امیر شریعت مدظلہ اور دوسرے اکثر زعمائے خلافت کو تین تین سال کی سزا دیکر میانوالی جیل میں محبوس کر دیا گیا تھا۔ چونکہ تحریک اہم تھی اسلئے اس کی پاداش میں ملی ہوئی سزا کو اپنے "جرم بغاوتِ فرنگ" کے مقابلہ میں ہیچ سمجھکر یہ تبصرہ کیا گیا ہے۔

٦ —————— ★

چمن کو اِسلئے مالی نے خوں سے سینچا تھا !
کہ اُسکی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں ؟

○

شانِ ورود —————— اس کے متعلق خود فرمایا —— !

(" غالباً سنہ ١٣٦٢ھ یا سنہ ١٩٤٤ء کے موسم سرما کا واقعہ ہے ۔ لاہور سے امرتسر یا کسی اور جگہ کے لئے سفر کرتے وقت گاڑی میں سوار تھے ، تو مشہور احرار کارکن) حافظ عبدالرحمٰن لائلپوری ' یا اُن کے (مرحوم) بھائی کے پاس کوئی پرچہ تھا ۔ جس میں ساحر لدھیانوی کی مشہور نظم جو قحط بنگال کے متعلق ہے ۔ وہ انہوں نے پڑھکر سنائی تو میں نے وہیں یہ شعر لکھا پھر (اُنہی دنوں امرتسر پہنچنے پر ایک روز صبح دس بجے کے قریب) ساحر لدھیانوی خود آئے ۔ ان کے ساتھ شورش کاشمیری اور غالباً فیروز دین منصور (مشہور کمیونسٹ لیڈر) بھی تھے ۔ میں نے اُن سے کہا ۔ کہ یہ شعر میں تمہیں دیتا ہوں ۔ اس پر ساحر بہت مسرور ہوئے اور کہا کہ میں —— اِسے قبول کرتا ہوں " ——

● — چنانچہ ساحرؔ کے مجموعۂ کلام "تلخیاں" — میں یہ شعر اُن کی اُسی مشہور نظم کا حصہ بن کر شائع ہو چکا ہے۔ اور جس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ دراصل حضرۃ امیر شریعت مدظلہ کی فکری کاوش کا نتیجہ ہے نیز قحطِ بنگال کے صحیح حالات، اس کے نتائج، ملک اور قوم کی پوزیشن، انگریزی سامراج کی عیاری اور بیگانہ وشی، اپنوں کی منافقت کے سبب تحریک آزادی کو نقصان پہنچنے پر ایک حساس دِل کے جذبات کی کامیاب عکاسی ہے

---

۷ ——— ⭑

لولاک ذرّہ زجہان محمدؐ است
سبحان من یراہ چہ شان محمدؐ است

سیپارہ ۳۰ کلام الٰہی خدا گواہ!
آں ہم عبارتے ز زبانِ محمدؐ است

نازد بنام پاکِ محمدؐ کلام پاک
نازم بآں کلام کہ جانِ محمدؐ است

توحید را کہ نقطۂ پرکارِ دین ماست
دانی! کہ نکتۂ ز بیان محمدؐ است

سرِ قضا و قدر ہمیں است اے ندیم
پیکانِ امرِ حق زِ کمانِ محمدؐ است

شانِ ورود

—— اس کے متعلق خود فرمایا —— !

"کادیان یا بٹالہ میں منعقد ہونے والی کسی جلسہ یا احرار کانفرنس کو (غالباً رمضان ۱۳۶۳ھ - جون ۱۹۴۴ء میں) جب مرزائیوں کے اشارہ سے حکومت نے ممنوع قرار دیدیا تو لاہور میں مجلس کی طرف سے احتجاجی جلسہ رکھا گیا - اس میں شرکت کے لیے میں شام کے بعد امرتسر سے سوار ہوا ، اتفاق سے لاری راستے میں فیل ہو گئی اور اسے چلاتے چلاتے بارہ [12] ساڑھے بارہ بج گئے - دل کو صدمہ ہوا ، اور اسی وقت دھیان مدینہ منورہ کی طرف چلا گیا اور چلتی لاری میں نعت کے ابتدائی تین اشعار موزوں ہو گئے - میں بہت دیر سے لاہور پہنچا —— جلسہ گاہ کے قریب آیا تو اس وقت مولانا بہاء الحق قاسمی احتجاجی ریزولیوشن کے آخری الفاظ کہہ رہے تھے ، اجلاس قریب الاختتام تھا - میں سٹیج پر پہنچ گیا - رات کے دو ۲ بج چکے تھے - میں نے اسی تاثر میں کافی دیر تک تقریر بھی کی - اور یہ اشعار مجمع عام میں تمام واقعہ دہرا کر پڑھے ، اور بقیہ دو ۲ شعر (مجھ سے خصوصی خطاب کرتے ہوئے فرمایا) آپ کو معلوم ہی ہے - اسی سال رمضان المبارک کے ایام میں گھر پر مکمل ہوئے تھے " —— یہ ہے اس نعت کا شانِ ورود —— واللہ اعلم !

٨ —————— ★

گر ہو دوامِ عشق کی تلخی نصیبِ عقل؟
بنتی ہے پھر تو بادہ و ساغر کہے بغیر!

○

شانِ وُرُود ——— اس کے متعلق خود فرمایا ——— !

"(شوال ۱۳۶۴ھ - اگست ۱۹۴۵ء کا واقعہ ہے) سری نگر (کشمیر) کے ایک ہوٹل میں ہم بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ میں تھا۔ خواجہ غلام محمد (حالیہ رکن نیشنل کانفرنس) بھی تھے۔ اور ساتھ والے کمرے میں کچھ نوجوان بھی چائے پی رہے تھے اور شعر پڑھ رہے تھے ۔ انہوں نے غالب کا شعر پڑھا، کہ ؎

جب تک نہ ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر!

تو میں نے فوراً وہیں ایک پرزے پر لکھ کر نوکر سے کہا، کہ یہ کاغذ ان بابو لوگوں کی میز پر رکھکر چپ چاپ چلے آؤ کہنا کچھ مت، شعر تھا ؎

گر ہو دوا، عشق کی تلخی نصیبِ عقل ✣ بنتی ہے پھر تو بادہ و ساغر کہے بغیر

چنانچہ ~~بیرا~~ کاغذ رکھ کے واپس آگیا۔ تو میں نے اپنے کمرے کی کنڈی لگا دی۔ مجھے معلوم تھا کہ اُن سے صبر نہیں ہوگا۔ اور وہی ہوا، کہ جیسے ہی انہوں نے کاغذ لے کر پڑھا اور دُہرایا، تو مجھے بھی آواز آئی، ایک دوسرے سے پوچھ رہا تھا، کہ ہائیں کیا کہا؟ —— اور دو منٹ بعد وہ میرے کمرے کا دروازہ توڑ رہے تھے۔ نوکر گیا تو کہنے لگے کہ بتاؤ اندر کون بیٹھا ہے۔ اور یہ شعر کس نے بھیجا ہے۔ اس نے میرا نام لیا۔ بس پھر کیا تھا۔ پاگل ہو گئے اور دوڑتے ہوئے اندر آکر مجھے چمٹ گئے —— کہ پھر سنائیے، میں نے کہا، بتاؤ —" بنتی ہے کہ نہیں —— اب غالب کا جواب ہوا کہ نہیں" —— کہنے لگے۔ "جی پہلے تو نہیں، لیکن اب تو بادۂ و ساغر کے بغیر بھی بنتی ہے، ہم نے آج تک یہ مضمون نہیں سُنا۔ ہم حیران ہو رہے تھے کہ آخر یہ کون ہے۔ کہ جس نے اتنا برجستہ جواب لکھا ہے۔ آپ کا نام سُنا تو یقین آگیا۔ کہ یہ جواب وہی دے سکتے ہیں" —— !

---

۹ ———— ★

جب تک کہ غیرِ حق کی یونہی بندگی ہے دوست
یہ زندگی بھی میری کوئی زندگی ہے دوست؟
ذرّوں سے تا بہ مہر، ستاروں سے تا چمن
عکسِ جمالِ یار کی تابندگی ہے دوست!

○

شانِ ورود — اسکے متعلق خود فرمایا —!

"(اغلباً محرم ۱۳۶۵ھ دسمبر ۱۹۴۵ء کا واقعہ ہے) مولوی مظہر علی کے حلقۂ انتخاب میں تقریر کیلئے میں لاہور سے ڈسکہ جا رہا تھا اور شورش — میرے ساتھ تھا — لاری — جا رہی تھی تو میں نے اس سے مخاطب کر کے کہا: "شورش اس زندگی کا بھی کچھ فائدہ ہے جو کفر کے قانون کے ماتحت بسر ہو رہی ہے؟ اور وہیں یہ شعر پڑھ کر سنا دیا —"

● — گویا قراردادِ حکومتِ الٰہیہ — ۱۳۶۲ھ اپریل ۱۹۴۳ء کے بعد جماعت کا جو نصب العین اور لائحۂ عمل ہر وقت مدِنظر رہتا تھا۔ اسی کا تاثر شعر کی صورت میں رونما ہوا۔ اس میں موجودہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے نقائص کی طرف مصلحانہ اشارہ اور ترغیب و تبلیغ کا پہلو مضمر ہے —!

ساطعہ

۱۰ ★

هزار صبح بهار از نگاه می چکدش
جنون ز سایهٔ زلف سیاه می چکدش

چمن چمن گل و نسرین ز عکس رخ ریزد
سبد سبد گل خندان ز راه می چکدش

به پیشگاه جمالش جلال سر به سجود
چه خنده و چه تبسم که جاه می چکدش

صد آفتاب به زیر گلیم می رخشد
ز ذوق فقر چه گویم که ماه می چکدش

چہ شور ہاست بجانم زخندۂ نمکیں؟
چہ فتنہ ہا کہ زچشم سیاہ می چکدش؟

ہزار حشر بدامن، ہزار فتنہ بجیب
ہزار فتنہ زچشم سیاہ می چکدش

گفتگو چہ تبسم شہادتے نخدد
زنور چہرۂ قدم را گواہ می چکدش

قدم بہ جلوہ بہ بین و حدوث را بہ جبیں
چہ جلوہ و چہ جبیں لا الٰہ می چکدش؟

نگہ گنبد بہ بخت بلند بیوہ زلے
کہ از کنار غریبش چہ ماہ می چکدش؟

حذر ز خاک نشینے شکستہ دل ریش
کہ صد ہزار جہنّم ز آہ می چکدش

ز مہر و ماہ سلام و ز برگ برگ درود
چہ خاک طیبہ ہے کہ شام و پگاہ می چکدش؟

بہ تو ندیم سیہ رو چہ ماجریٰ گوید؟
جز ایں کہ از سر ہر مو گناہ می چکدش

○

شانِ وُرُود ـــــ اسکے متعلق خود فرمایا ـــــ !

" محرم ۱۳۶۵ھ ۔ دسمبر ۱۹۴۵ء ہی کا واقعہ ہے) الیکشن کے دنوں میں (یعنی انتخابات منعقد ہونے سے چند روز پہلے) سردار محمد شفیع کے حلقۂ انتخاب میں دورہ تھا ـــــ اور یہ دورہ پنجاب میں آخری تھا ـــــ لاری میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے میں نے دیکھا کہ سڑک کے

دونوں کناروں میں سرسوں کے کھلے ہوئے پھولوں سے تختۂ زمین بسنتی بنا ہوا، نگاہوں کے لئے ایک محشرِ بہار دکھائی دیتا تھا۔ اتنے میں سڑک کے کچے گڑھوں کی وجہ سے گرد و غبار بہت اڑنے لگا۔ تو میں نے چہرے پر رومال لپیٹ لیا۔ طبیعت اس نظارے سے بہت متأثر ہوئی۔ خیال مدینۂ طیبہ کی طرف منتقل ہو گیا۔ اور منظرِ بہار سے حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اطہر کا تصور پیدا ہو گیا۔ اسی کیفیت میں — یہ بہارِ رحمت — لکھنی شروع کی اور پھر اسی سفر میں لاریوں پر ہی یہ نعت مکمل ہوئی — یہ ہے نعت کا شانِ ورود —"

۱۱

ھری پور ہزارہ کے جلسہ کے بعد
یہ آرڈر ملا جیشِ احرار کو
کہ جانا ہے تم کو اکوڑہ خٹک
یہ فرمان سنتے ہی سب سرخپوش
باندازِ خاص و بجوش و خروش
روانہ ہوئے سوئے رود اٹک
ہوئی شام اور سرخپوش آ گئے
اٹک پر برنگ شفق چھا گئے
دیئے سب نے اپنے بکس اور بستر پٹک

کسی کو جو فطری تقاضے ہوا

مؤدّب وہ اِس طرح گویا ہوا

کہ دوں اپنی پوری کو کس جا جھٹک

یہ فرمایا اُٹھ کر کے اک خان نے

وہ اک محترم اور ذیشان نے

بشانِ خصوصی قومِ خٹک

خوا تم نے سُنا ہے وہ شپّر کا بات

جو اُس نے کہا اپنے محرمان سے

دِکھا کر کے اپنی لٹک اور مٹک

یہاں تک مٹی کی حاجت نہیں
جہاں ہم لٹکتا ہے تو بھی لٹک!

○

شانِ ورود ـــــ اس کے متعلق خود فرمایا ـــــ!

"(اغلباً صفر ۱۳۶۵ھ، جنوری ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے) الیکشن ہی کا زمانہ تھا۔ میں پنجاب سے فارغ ہو کر سرحد پہنچا، شاید کچھ انتخابات ہو چکے تھے اور کچھ باقی تھے۔ مجھے پروگرام کے مطابق کئی جگہ تقریریں کرنی تھیں۔ اسی سلسلہ میں ہزارہ پہنچا۔ وہاں کانفرنس ختم ہوئی تو ـــ اکوڑہ خٹک پہنچے۔ بیت الخلاء کی ضرورت ہوئی تو میں نے پوچھا کہ بھائی پیشاب پاخانے کے لئے کوئی جگہ ہے۔ تو مولانا غلام غوث کہنے لگے کہ جہاں ہم گئے تھے وہیں کہیں آپ بھی بیٹھ جائیے۔ اب جو میں نے باہر نکل کر دیکھا تو کھلا میدان ہے۔ اس میں کوئی دائیں سے آ رہا ہے کوئی بائیں سے کوئی آگے سے کوئی پیچھے سے، اب بیٹھوں تو کہاں ـــــ؟ میں واپس آ کر کمرے میں چپ چاپ لیٹ گیا۔ اور وہیں یہ نظم لکھ دی۔ مجھے ـــ "چمگادڑ کے مہمان" کی ضرب المثل یاد آ گئی۔ کہ اس کے پاس کوئی مہمان آ گیا۔ اس نے کہا بھائی کہاں بیٹھیں اٹھیں، دن کا وقت تھا۔ اور دن کو چمگادڑ درختوں یا مکانوں میں الٹے لٹکے رہتے ہیں۔ اس نے وہیں سے جواب دیا، کہ "بھائی جہاں ہم لٹکے ہوئے ہیں تم بھی وہیں لٹک جاؤ۔" اور یہی قصہ مجھے اکوڑہ خٹک میں پیش آ گیا۔ کہ جن کے مہمان تھے۔

انہوں نے بھی " جہاں ہم لٹکے ہوئے ہیں، تم بھی وہیں لٹک جاؤ " ـــــ کی قسم کا مشورہ دے دیا۔ یعنی جہاں وہ خود لٹکے ہوئے تھے ہمیں بھی لٹکانا چاہا " !

" مولانا نے مجھے مشغول دیکھا، تو باہر سے ہی بول اٹھے۔ کہ آپ کہیں نظم تو نہیں لکھ رہے ہیں ؟ میں نے کہا، ہاں لکھ تو رہا ہوں، کہنے لگے سنائیے ! میں نے پڑھی تو کہنے لگے یہ لوگوں کو مت سنائیے گا ! میں نے کہا، اچھا دیکھا جائیگا۔ چنانچہ جب سب اکٹھے ہوگئے تو میں نے چپکے سے کاغذ نکال کر نظم پڑھنی شروع کردی۔ بس پھر جو حال ہوا، وہ بیان سے باہر ہے "

---

۱۲ —— ★

عجب سر زمیں ہے زمینِ ہزارہ!
یہ مٹّی نہیں! بلکہ ہے سنگِ خارا
سیہ مدّتوں سے ہے تاریخ اسکی
سکھّوں سے ملی سیّد احمدؒ کو مارا
خمیر اس کی فطرت کا مسلم کشی ہے
کبھی مصر پیٹا، کبھی ترک مارا
فرنگی بچوں ہی کی اسنے مدد کی
رہا جیتتا ہی بخاری بچارا

اِسے وعظ سُننے کا نہ شوق بیحد
نتیجہ نہیں کچھ بھی الاَفرارا

ستاروں کی آپس میں یہ گفتگو تھی
مقدّر نہیں اس کے الاَثبارا

یہی ورد کرتا ہے ہر دم بنوری[1]
علی گل نے مارا علی گل نے مارا

میں قربان تیرے زمین ہزارہ
کہ جب تُو نے مارا تو سیّد ہی مارا

ہری پور میں کہتا ہے عبدالسلام[2]
مجھے تو فقط قاضی اکرم نے مارا

[1] سید محمد شاہ بنوری سابق ناظم مجلس احرار اسلام پاکستان
[2] حکیم عبدالسلام ہزاروی سابق رکن عاملہ احرار

شانِ وُرُود ــــ اِس کے متعلق خود فرمایا ــــ!

"(صفر ۱۳۶۵ھ ـ جنوری ۱۹۴۶ء ہی کا واقعہ ہے) سرائے صالح میں (ایک سابق اور مشہور احرار کارکن) اورنگزیب خان کے گھر میں دسترخوان پر کھانا کھاتے ہوئے (ہزارہ کے حالات سے متاثر ہو کر) میں نے (کسی سے) کہا کہ لکھو ؎

عجب سرزمیں ہے زمینِ ہزارہ!

اور وہیں (فی البدیہ) یہ نظم لکھوا دی"!

۱۳ ——————— ★

نہ دیدم کشورے مردود و مرتاب
بشومیہائے کفر آباد پنجاب
چہ ملکے ننگ و عارِ ہفت کشور؟
ز شرق و غرب بادش خاک بر سر!
خمیرِ طینتش مردم کشیہا
ز قتلِ مسلمش باشد خوشیہا
چہ پیرانش مریدانِ فرنگی
لقب کافور و ذاتِ پاک زنگی

زِ نوّابِ و رئیسانش چہ پرسی
سگ و سگ زادگاں کرسی بہ کرسی

چناں فرزندِ ناہموار زاید
کہ از خر قیمتش برتر نیاید

چکد از لالۂ اش خونِ مسلماں
از و نالاں حجاز و مصر و ایراں

جوانانش غلامانِ فرنگی
پناہ شاں بدامانِ فرنگی!

چہ پنجاب؟ آں فرنگی را معسکر
معسکر را غلامِ احمد پیمبر

فرنگی را مُعسکر ہست پنجاب
ضلالت را پیمبر ہست پنجاب

فضائش کُفر بیز و کُفر بیز است
بآئینِ الٰہی در ستیز است

بملکِ ہند شد ارض الجواسیس
نہ جاں محفوظ نے مصئوں نوامیس

زمینے فتنہ زائے فتنہ خیزے
کہ شیطاں پیش پایش سجدہ ریزے

نشر کرت

○

شانِ ورود ـــــ اس کے متعلق خود فرمایا ـــــ!

"انتخابی دوروں سے یوں بھی میں تھکا ہوا تھا۔ کہ ہزارہ سنسنداپی پر مجھے بخار بھی ہو گیا تو میں آرام

کے لئے پشاور میں ٹھہر گیا۔ دفتر احرار ہی میں قیام تھا۔ ادھر پنجاب سے ہماری جماعت کے امیدواروں کی شکست پر شکست کی خبریں آرہی تھیں۔ حتیٰ کہ مولوی مظہر علی صاحب کہ جنکی سیٹ کے متعلق کامیابی کا یقین تھا، وہ بھی ہار گئے۔ تو قوم کے سلوک اور اور اپنی بے بسی دیکھ کر دل کو سخت صدمہ ہوا۔ میں وہیں دفتر کے اندر والے کمرے میں جو سڑک کے کنارے پر ہے، بستر پر پڑا ہوا تھا۔ کہ مولانا غنیمت کنجاہی رحمۃ اللہ علیہ یاد آگئے ان کی مشہور مثنوی "مثنوی غنیمت" کی طرف دھیان چلا گیا۔ جس میں انہوں نے پنجاب کی بے حد تعریف کی ہے اور اس کے مٹی پانی کو جنت اور کوثر بنا کے رکھ دیا ہے تو میں نے سوچا کہ جس پنجاب کا مولانا ذکر کر رہے ہیں وہ تو آج موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس پنجاب نے جو جو مذہبی اور سیاسی طوفان اٹھائے ہیں ان سے یہ سرزمین جہنم کا نمونہ بن کر رہ گئی ہے۔ اگرچہ یہاں سے اچھے لوگ بھی پیدا ہوئے۔ اور اچھی تحریکیں بھی اٹھی ہیں لیکن اکثریت کے لحاظ سے ملک میں جو بد سے بد تحریک اٹھی اور جو خبیث سے خبیث فتنہ پھیلا وہ پنجاب ہی سے اٹھا۔ اسی میں پھلا پھولا، پروان چڑھا اور یہیں سے سارے ملک میں پھیلا، اور فرنگی کے لئے مددگار ثابت ہوا۔ مرزائیت اٹھی تو یہیں سے، اور چکڑالویت نکلی تو یہیں سے، خصوصاً یہاں کے سرکاری مولوی، گدی پیر ملک اور قوم کے غدار اور دشمن فرنگی کے پالتو اور وفادار نواب، خان بہادر اور بڑے بڑے فرعون نما زمیندار اور رئیس۔ تو ایک مستقل لعنت بن کے ملک پر مسلط ہوئے ہیں۔ انہوں نے غلامی کے کھونٹے گاڑ رکھے ہیں۔ اور انگریز کی پناہ گاہیں بن کر تحریک آزادیٔ وطن کو برباد کیا ہے! — تو پھر یہ پنجاب، مولانا غنیمت کا حسن و عشق والا پنجاب تو نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ پنجاب تو کفر اور غلامی کا مرکز ہے۔ بس اس خیال سے میں نے وہیں بستر پر لیٹے لیٹے کاغذ پنسل اٹھایا۔ جو اکثر میرے سرہانے رکھے رہتے تھے اور اسی بخار کی حالت میں اور صدمۂ غم کی کیفیت میں یہ مثنوی لکھ ڈالی جو زبان و بیان اور مضمون کے لحاظ سے بھی غنیمت کا خطرناک جواب ہے، اور آئندہ کیلئے تو بحمد اللہ کہہ سکتا ہوں کہ اس انداز میں لکھنے کیلئے قلم توڑ کر رکھ دیا ہے، اب لکھتا رہے جس کی ہمت ہے۔ فقیر نے اپنا کام تو کر دیا ہے"

۱۴ ———— ★

حضرتِ غوثِ ہزارہ کے حکیمِ حاذق جو کہ بیمار سے کم فیس لیا کرتے ہیں! اَب یہ معلوم ہوا ہے کہ بخاروں میں حضور کُشتۂ خایۂ ابلیس دیا کرتے ہیں!

○

شانِ وُرُود ——— اسکے متعلق خود فرمایا ———!

"انہی دنوں (یعنی صفر ۱۳۶۵ھ - جنوری ۱۹۴۶ء) کی بات ہے۔ میں (مجلس احرار اسلام پشاور کے) دفتر میں بخار سے پڑا ہوا تھا۔ کہ اتنے میں مولانا غلام غوث آئے، اور پوچھنے لگے کہ کیا بات ہے؟ میں نے کہا۔ بخار ہے! کہنے لگے میرے پاس کرنجوا ہے، وہ کھا لیجیے۔ میں نے کہا کڑوا ہوگا، تو کہنے لگے بخار میں مفید ہوتا ہے۔ میں نے کہا دیجیے۔ میں نے ہتھیلی پر رکھ کر منہ میں ڈال لیا اور اوپر سے پانی پی لیا۔ جب میں دوا کھا کر

پانی پی چکا تو نہایت متانت سے کہنے لگے۔ آپ کو معلوم ہے اسے فارسی میں کیا کہتے ہیں؟ میں نے کہا نہیں! کہنے لگے ــــ اس کا نام "خایۂ ابلیس" ہے۔ اور اس پر ایک زور کا قہقہہ لگا۔ میں نے کہا خدا کے بندے! یہی کرنا تھا تو کھانے سے پہلے ہی بتا دیا ہوتا۔ تو فرماتے ہیں بتا دیتا، تو آپ کھاتے ہی کہاں؟ خیر! کوئی حرج نہیں۔ چیز مفید ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ لے بھائی پٹھان چوٹ کر گیا۔ اگر اس کا جواب نہ ہو تو بات نہیں بنتی۔ خیر اس وقت تو میں نے بات ٹال دی اور چپ ہو کر لیٹ رہا۔ لیکن دھیان اسی طرف تھا کہ کچھ ہونا ضرور چاہیئے۔ مولانا تو یہ کہہ کر ایک طرف ہٹ گئے۔ اور باہر برآمدے والے کمرے میں جا کر لیٹ گئے۔ اور میں نے کاپی پنسل جو میرے سرہانے رکھی تھی اٹھا کر یہ قطعہ لکھا۔ اب مولانا کو فکر ہوئی، کیونکہ وہ مجھے لکھتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ تو وہیں سے گھبرا کر پوچھنے لگے کہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ میں نے کہا آپ کا قصیدہ لکھ رہا ہوں۔ مجھے کرنجوا کھلا کر آپ نے اُسے "خایۂ ابلیس" بنایا ہے۔ تو آپ کی تعریف لکھی ہے۔ تاکہ بیماروں کو آپکے علاج اور دواؤں کا پتہ چل جائے کہ آپ کیا کچھ کرتے ــ اور کھلاتے رہتے ہیں۔ کہنے لگے اچھا سنائیے! میں نے یہ قطعہ پڑھا، اب جو سنا تو ــ لاحول ولا قوۃ۔ پڑھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کہنے لگے کہ کشتہ نہیں بلکہ سفوف تھا؟ میں نے کہا اچھا! پہلے نہیں تھا تو اب "کشتہ" ہو گیا! ــــ اس پر بے چارے بہت پریشان ہوئے۔ اور لوگوں کو سنانے سے روکتے رہے ــ اور مجلس میں ایک تماشا بنا رہا!"

---

۱۵ ——— ٭

بخت اگر رسا شود، دست دہد سبوئے خویش
از نگہِ سمن برے، لالہ رُخے نکوئے خویش

باغ و بہار ماندِ سیر، یعنی کہ جنۃ النعیم
رُوئے خوش است و خوئے خوش، بوئے خوش و گلوئے خوش

○

شانِ وُرُود ——— اسکے متعلق خود فرمایا ———!

"(اغلباً ربیع الثانی ۱۳۶۵ھ - مارچ ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے) نصر اللہ خان[1] کے علاقہ میں

---

[1] نوابزادہ نصر اللہ خان ناصر ابن نواب سیف اللہ خان المعین زئی مرحوم رئیس اعظم خان گڑھ ضلع مظفر گڑھ سابق ناظم اعلیٰ مجلس احرار اسلام - ہند -

(تبلیغی) دورہ تھا۔ خانگڑھ میں ان کے مکان پر ہی ان اوصافِ حسنہ کا تذکرہ ہوا۔ جنکی وابستگی پر حیوۃِ عشق کا مدار ہے۔ میں نے اس کے متعلق چار چیزیں برجستہ کہیں جنمیں سے بعض کا ذکر فارسی شاعری میں انفرادی طور پر ملتا ہے۔ اتفاقاً مصرع موزوں ہوگیا۔ کہ ؎

روئے خوش است و خوئے خوش، بوئے خوش و گلوئے خوش

کچھ وقت گذرنے پر یہ دو شعر ہوگئے۔ خانگڑھ سے شہر سلطان کے جلسہ کے لئے آنا تھا۔ اور خانصاحب کی صدارت تھی، میں جلسہ گاہ میں پہنچ گیا، لیکن دیکھا تو خانصاحب موجود نہیں ہیں۔ قیام گاہ پر دو دفعہ آدمی بھیجا کہ انہیں بلا لاؤ۔ لیکن جواب ملا کہ سر میں درد ہے! مجھے کھٹک ہوئی کہ وہ اس مصرع پر غزل لکھ رہے ہوں گے۔ بات یہی تھی، جلسہ ختم ہوا۔ وہاں (قیام گاہ) پہنچے تو آپ کچھ گنگنا رہے تھے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ غزل ہوگئی ہے۔ اور مقطع بھی! مگر مقطع نہیں ہو رہا، کوشش یہ تھی کہ یہی (میرے والا) مصرع مقطع میں آجائے وہاں سے واپس ہوئے لاری کا سفر تھا۔ ہم دونوں ایک ہی سیٹ پر بیٹھ گئے اور مقطع مدنظر تھا۔ — ایکدم میں نے یہ مصرع پڑھ کر مقطع پورا کر دیا۔ کہ ؎

"ناصرِ خستہ دل بیا، جانِ جہان خود نگر
روئے خوش است و خوئے خوش، بوئے خوش و گلوئے خوش

خان صاحب بھی سن کر جھوم اٹھے۔ بہت داد دی اور اس طرح یہ شعر انکی غزل میں شامل ہوگیا"

● —— نصر اللہ خان ناصر کی غزل قارئین کرام کی نباضتِ طبع کے لئے درج ذیل ہے، پڑھیے اور سردھنیئے، اور دو رفقاءِ علم و ادب، ندیمانِ شعر و سخن، اور رہروانِ تدبّر و سیاست کے ذوقِ سلیم اور حسنِ کلام کی داد دیجئے! فرماتے ہیں —!

گرچہ تنگ نمی دہد شستہ آرزوئے خوش	کیف بہار در خزاں، داد خیالِ روئے خوش
لغزشِ پائے ناز او، برقِ نگہ بعقل و ہوش	خیز بگلستاں کنیم، شورشِ ہا و ہوئے خوش
عارضِ او ریاضِ او، ماہِ کمالِ دلبری	قامتِ جاں نواز او، سرو کنارِ جوئے خوش
سیل بہر رود، نور شد موجِ زناں زنغمہ اش	برقِ بجانِ عاشقی می فگند از گلوئے خوش

گنبدِ سبز در نظر، رقص کناں ہمی روم — روضۂ دل نوازِ او، خانۂ خوش بکوئے خوش
سیّدِ ما امیرِ ما، دِلش بوجد خوشش بخولدہ — "بخت اگر رسا شود، دست دہد بسوئے خوش"
"ناصرِ خستہ دل بیا، جانِ جہان من نگر" — "روئے خوش است و خوئے خوش، بوئے خوش و گلوئے خوش"

● —— اس دورہ سے واپس آکر آپ کو خیر المدارس کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لئے جالندھر پہنچنا تھا، حضرۃ مخدوم العلماء قاری محمد طیب قاسمی دامَ مجدہٗ۔ نماز جمعہ کے بعد "شانِ رسالۃ" کے پاکیزہ موضوع پر اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں پُر معارف تقریر فرما رہے تھے کہ اچانک قبلہ شاہ صاحب — قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور مرزا جانباز امرتسری کی معیّۃ میں جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ تقریر اپنے شباب پر تھی، مجمع مسحور تھا۔ بڑے بڑے علماء کرام، قاسم العلوم والخیرات حضرۃ نانوتوی قدس سرّہٗ کے حقیقی جانشین کے خطاب پر سر دھن رہے تھے۔ شاہ صاحب کچھ دیر تو خاموش بیٹھے رہے، مگر پھر تو وجد کی سی حالۃ پیدا ہوگئی۔ بے اختیار نعرہ تکبیر بلند کیا، اور دو منٹ کی اجازۃ لے کر دورانِ تقریر میں ہی خود مائیکروفون پر آکھڑے ہوئے۔ اور اسی کیفیّۃ میں مستانہ وار اپنے مخصوص لحن سے یہ دونوں شعر حضرۃ قاری صاحب دام ظلہٗ کیطرف ہاتھ سے بار بار اشارہ کرکے اور مجمع کیطرف مخاطب ہوکر پڑھے، یہ چشم دید واقعہ ہے کہ تمام علماء طلبہ اور عوام بھی وجد و سرور کی حالۃ میں تھے اور اشکبار تھے۔ ایک عجیب پُر انوار نظارہ تھا۔ جو کسی بھی روحانی محفل میں بمقتضٰی حدیث نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام۔ چشمِ بصیرۃ سے دیکھا جاسکتا ہے۔ پھر فرمایا —— !

"یہ دو شعر میں نے سفر میں کہے ہیں۔ ان کا موضوع بھی کچھ اور ہے، لیکن وقت کی مناسبۃ اور شخصیّۃ کی مطابقۃ سے (کہ وہ حُسن صورۃ و سیرۃ کا مُرقع ہے) یہ دونوں شعر حضرۃ قاری صاحب سلّمہُ اللہ تعالیٰ کی نذر کرتا ہوں۔ گر قبول افتد زہے عزّ و شرف لوگو! یہ قاری طیّب نہیں بول رہے تھے۔ یہ قاسم نانوتوی (رحمہ اللہ) کی روح بول رہی تھی۔ دُعا کرو اللہ تعالیٰ ایسے صالح اور متّقی، نوجوان علماء کا سایہ تادیر قائم رکھے۔ آمین !!"

اسکے بعد تقریر پھر شروع ہوگئی۔ اور جلسہ کی کارروائی حسب نظامُ الاوقات۔ سرانجام پاتی رہی ! ——

۱؎ حضرۃ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری
۲؎ حضرۃ ظفر [illegible] شریعت اشارہ ہے۔

۱۶ ——— ★

یک نانِ جویں زِ خوانِ شاہی خوشتر
از چنگ و رباب، آہِ صبحگاہی خوشتر
از تیرِ نگاہ زخمِ کاری دارم
خونِ جگرم زِ مُرغ و ماہی خوشتر
یک لحظہ بزیرِ سایۂ قدِ یار
وَاللہ! زِ ہزار چترِ شاہی خوشتر

○

شانِ ورود ـــــ اِس کے متعلق خود فرمایا ـــــ :

"ـــ (اغلباً ربیع الاول ۱۳۶۵ھ ـ فروری ۱۹۴۶ء کے اوائل کا واقعہ ہے ۔) حضرۃ شیخ الجامعۃ العباسیہ مولانا غلام محمد گھوٹوی رحمۃ اللہ علیہ لاہور سے واپس تشریف لا رہے تھے ۔ اور میں بہاولپور کے سفر کے لئے طیار تھا ۔ لاہور اسٹیشن پر ملاقات ہوئی ۔ پھر ہم دونوں ایک ہی ڈبے میں سوار ہو گئے ۔ گاڑی روانہ ہوئی ۔ کسی ایک سٹیشن پر مولانا نے روٹی والے سے چند روٹیاں اور بھنے ہوئے چنے یا کوئی اور سالن خریدا ۔ پھر دستر خوان بچھایا اور فرمانے لگے :

" حضرۃ: نانِ جویں حاضر ہے !"

میں نے جواباً عرض کیا کہ :

" حضرۃ یہ نانِ جویں نہیں ، خوانِ شاہی ہے !"

پھر اُن کے ساتھ ہی کھانا کھایا ۔ چنانچہ اس واقعہ پر اُسی وقت یہ تین شعر موزوں ہو گئے ۔ تو میں نے وہیں لکھکر مولانا کو سُنا دئے ـــ !"

---

۱۷ ——— ٭

نہ یہ وَالتّین کی دنیا، نہ وَالزّیتون کی دنیا
نہ یہ مفروض کی دنیا نہ یہ مسنون کی دنیا
طلسم سامری ہے یہ نہ ہے ھارون کی دنیا
یہ ہے فرعون کی دنیا یہ ہے قارون کی دنیا
یہ ہے مردود کی دنیا یہ ہے ملعون کی دنیا
نہ یہ ھارون کی دنیا نہ یہ مامون کی دنیا
تم اس دنیا کو کیا جانو، یہ دنیا کیسی دنیا ہے؟
یہ فسق و رجس کی دنیا عذاب الھون کی دنیا

یہاں آکر ہزاروں عصمتیں قربان ہوتی ہیں
یہ مکر و زور کی دنیا یہ قتل و خون کی دنیا
یہ قوالوں کی دنیا اور گراموفون کی دنیا

○

شانِ نزول —— اسکے متعلق خود فرمایا ——!

"—— اسی سفر میں یہ نظم بھی ایک تاثر کے ماتحت فی البدیہ لکھی گئی - جسکا بیان نہ مناسب ہے۔ نہ اسکی ضرورت - بہرحال اور کچھ نہ سہی موجودہ گمراہ اور خدا سے باغی دنیا کی مذمت تو ہے ہی -"

۱۸ ———— ٭

گلخنِ عشقِ چشتیاں بہ طپید
شعلہ اش خواجہ غلام فرید

ہر کہ از عشق جرعہ نہ چشید
او چہ داند کہ چیست خواجہ فرید؟

مرغِ فکرم ز آشیاں بہ پرید
نالہائے فرید چوں بشنید

رہبرِ عاشقانِ پاک شتر
شاہدِ عاشقانِ بزمِ وحید

حضرت خواجہ غلام فرید صاحب رحمۃ اللہ علیہ
نامور ولی چشتیہ
مدفون چاچڑاں شریف
(ریاست بہاولپور)

هر کسے سوئے منزل است رواں
کسے آں جا رسید و کس نہ رسید

خواجہ در ذاتِ آں چناں پیوست ؟
ہمچو آں ذات نزدِ حبلِ ورید

خواجہ را داند آں حبیب کہ او
جرعۂ عشق ذات پاک چشید

دیگراں بخیہ کار و خواجۂ ما
جامۂ عشق پارہ پارہ درید

سرمۂ چشم شد بخاری را
خاکِ پائے غلامِ خواجہ فرید

حسرتے از دلِ ندیمہ نرفت
کہ نصیبش نہ شد نگاہِ فرید
ہر کہ بد گفت خواجہ ما را
ہست او بے گماں یزیدِ پلید

○

شانِ وُرُود ——— اس کے متعلق خود فرمایا ———!

"ربیع الاول ۱۳۶۵ھ - فروری ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے۔ الیکشن کے بعد ملتان ڈویژن کا دورہ تھا۔ بہاولپور میں منشی محمد حسن چغتائی کے مکان میں بیٹھا ہوا تھا۔ کہ ظہر کا وضو کرتے وقت یونہی خیال آیا۔ تو دماغ میں ایک مصرع بھی آگیا کہ ؎

مرغِ فکرم ز آشیاں بہ پرید

پھر نماز پڑھ کر فارغ ہوا تو لیٹ گیا۔ اور پلنگ پر لیٹے لیٹے یہ ساری نظم لکھ دی۔"

● ——— اس دورہ سے واپسی پر آپ جالندھر سے فارغ ہو کر وزارتی مشن کی آمد کی وجہ سے جماعتی نظم کے مطابق دہلی پہنچے، اور تقریباً دو ماہ قیام فرما کر واپس گھر تشریف لے آئے، تو ایک روز نواب نصر اللہ خان ناصر، شورش کاشمیری اور پربودھ چندر ایم۔ ایل۔ اے بغرض ملاقات امرتسر آ پہنچے۔ حسب دستور چائے کے دور کے بعد

حضرت مدظلہ نے یہ نظم سنائی، خانصاحب نے سن کر بہت داد دی، اور خود بھی اسی وقت سے "فکرِ سخن" میں مشغول ہو کر شام کو واپس لاہور چلے گئے۔ دوسرے ہی روز خط میں اسی انداز کی ایک نظم ارسال کر دی، قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے خانصاحب کا مکتوب، مع غزل درج ذیل ہے :

احرار آفس لاہور
۴/۷/۴۶ء

محترم شاہ جی : السلام علیکم ورحمۃ اللہ

طالب خیریت بخیریت، آج درخواست واپس لے لی ہے اور آج شام کی گاڑی سے گھر جا رہا ہوں۔ کل آپ نے جو نظم سنائی، اس پر کچھ تاثرات نظم ہو گئے ہیں۔ ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں ایک شعر تھا ؎

دیگران بخیہ می کنند و خواجۂ ما
دامنِ ہوش پارہ پارہ درید

پہلا مصرع وزن کے اعتبار سے صحیح نہیں، اگر یوں ہو جائے تو معانی اور مطالب میں ترمیم بھی نہ ہو گی اور درست بھی ہو جائیگا ؎ دیگران بخیہ کار و خواجۂ ما
دامنِ ہوش پارہ پارہ درید

منظوم

اللہ اللہ چہ ارمغان برسید؟	از زبانِ ندیم مدح فرید!
بعد مدّت چو ناصرِ محزوں	نغمۂ حیانِ عاشقی بشنید!
دل فدائے جہان بے تابی	مضطرب گشت و تاب ضبط رمید
اشک آئینہ دار سوزِ ازل	دانہ دانہ ز چشم من بچکید
فیضِ کلکِ ندیم ہست مگر	لالہا در زمینِ شعر دمید
لالہا ریزد و سمن بارد	خارِ غم در دلِ حزیں بخلید

بے خبر گشت ناصر از دو جہاں
جرعۂ از مئے ندیم چشید!

نصر اللہ خان

۱۹

اُچ شریف دا راڑھے اُچا
وِنجھیں اُس جا ہوکے نیچا

○

شانِ وُرُود ـــــ اس کے متعلق خود فرمایا ـــــ

"اسی دورہ میں غالباً بھاولپور رھگلوال میں ہی (جو کہ اُچ شریف کے نزدیک واقع ہے) غالباً خانقاہ اُچ شریف اور حضرۃ جلال الدین بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر آیا۔ تو اس پر ایک شعر موزوں ہوگیا"

ؔله۔ مدفن حضرۃ المخدوم سید جلال الدین بُخاری قُدِّسَ سِرُّہٗ (بہاولپور سٹیٹ)

ساطعۃ

نازنینانِ جہاں، ناز فراموش شدند
کہ گدائے تو بانداز دگر می نازد
نازدارد بہ دُر افشانی خود ابرِ بہار
دردمندِ تو بہ ناسورِ جگر می نازد
پارسایاں ہمہ نازند بہ زُھد و طاعت
یک ندیم است کہ بردامنِ تر می نازد

شانِ وُرُود ـــــ اس کے متعلق خود فرمایا ـــــ !

(غالباً ربیع الثانی ۱۳۶۵ھ ـــ مارچ ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے) دفتر مرکزیہ[1] لاہور ـــ میں ہم ایک دن بیٹھے ہوئے تھے، تو غالباً آغا شورش صاحب نے مولانا آزاد کا غبارِ خاطر میں نقل کردہ یہ شعر پڑھا ـ کہ ؎

"ہر کسے را دامنے تر ہست ـــ اما دیگراں !
بازمی پوشند، وما درآفتاب ـــ انداختہ"

تو میں نے تفنناً کہا کہ بھائی یہ تو کوئی کمال نہیں کہ آدمی ـــ کرتا پاجامہ دھوکر کانٹوں پر سوکھنے کے لئے ڈالدے، اپنا مشرب تو یہ ہے کہ دامن تر ہوائے تو اتنا ہلکا سکھائے نہ بنے ـ تاکہ ایک کام میں تو کمال حاصل ہو؟ اور پھر وہیں کچھ دیر بعد یہ اشعار موزوں ہوگئے تھے ـــ !

"پھر دلی میں جب مولوی حفظ الرحمٰن کو میں نے یہ شعر سنائے تو انہوں نے بہت پسند کئے دیر تک پڑھتے اور جھومتے رہے ـ پھر مجھ سے لکھنے کو کہا ـ چنانچہ میں نے خود اُن کی کاپی پر لکھدئے۔"

---

[1] ـ دفتر مرکزیہ مجلس احرار اسلام ہند بیرون دہلی دروازہ لاہور۔

۲۱ ——————— ☆

وحدت بوجد و حالتِ کثرت درآمده
حرکت بجلوه جلوه بحرکت درآمده
موسیٰ و طور و وادیِ ایمن حرا آم
هر جا که دیده ایست بحیرت درآمده

○

شانِ وُرُود ——— اس کے متعلق خود فرمایا ———

انتخاب کے بعد (دزارتِ مشن کی آمد سے کچھ عرصہ پہلے ربیع الثانی ۱۳۶۵ھ / مارچ ۱۹۴۶ء کے اواخر میں) دہلی جانا ہوا۔ ایک روز عبد الستار سالارِ دہلی کے ہاں میں سویا ہوا تھا۔ تو دیکھا، خواب میں یہ شعر بلند آواز سے پڑھ رہا ہوں۔ اتنے میں قاضی (احسان احمد) نے آکر جھنجھوڑا۔ اور زور زور سے شاہ جی! شاہ جی!! — کہ کر جگا دیا۔ گھبرا کر اٹھتے ہی میں نے کہا —

ارے ظالم مار ڈالا، شعر ہو رہے تھے، یہ تو نے کیا کیا؟ مولانا طالوت جو اُن دنوں
کسی کام سے دہلی گئے ہوئے تھے اور میرے ہی مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اُن سے
باتیں کرتے کرتے سو گیا تھا۔ میں نے فوراً انہیں مخاطب کیا اور غنودگی کی حالت میں ہی
ان کے زانو پہ ہاتھ رکھ کے کہا — ذرہ دیکھئے تو مولانا یہ شعر ٹھیک ہیں نا —؟ اور
— یہ شعر انہیں پڑھ کر سنائیے۔ تو وہ کہنے لگے جی ہاں! بالکل ٹھیک ہیں۔
میں نے کہا مولانا ابھی میں خواب میں یہ شعر پڑھ رہا تھا۔ اگر قاسمی نہ جگاتا تو پوری نظم
ہو جاتی —"

---

۴۲ —————— ٭

مونسِ من انیسِ من
در شبِ غم جلیسِ من

○

شانِ وُرُود —— اس کے متعلق خود فرمایا ——!

"قیامِ دلّی کے دوران ہی، مَیں ایک روز سو رہا تھا کہ پھر خواب میں القاء ہوا، اور دیکھا، زبان پر یہ شعر جاری ہے، اس کے بعد کوشش بھی کی، لیکن اس زمین میں نہ تو پوری نظم ہو سکی اور نہ ہی کسی اور شعر کا اضافہ ہوا۔ بس یہی ہے جو کچھ ہے" ——!

---

۴۴ ———— ★

ہاں لالہ زِغم خوں شد و از ہجرِ سمن زرد است
"ایں دیدۂ احمر ہم، وایں چہرۂ اصفر ہم"
دردے بجگر دارد بیمار غمت زینساں؟
خواہد نہ مداوائے، جوید نہ گہے مرہم

○

شانِ وُرُود ——— اس کے متعلق خود فرمایا ——— !

● ——— رمضان ۱۳۶۵ھ۔ اگست ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے امرتسر والے سکونتی مکان میں ایک روز دوپہر کے وقت جگر مرادآبادی کی ایک فارسی غزل کے بحر میں جسکا مطلع یہ ہے ؎

اے دیدہ اگر خواہی آہے ز ستمگر ہم؟
آہستہ بریز آبے، تا لب نہ شود تر ہم!

راقم السطور بیٹھا ہوا اپنی ایک فارسی نعت مکمل کر رہا تھا۔ کہ ایک مصرع اٹک کر رہ گیا، مناسب الفاظ کے لئے بہت سوچا۔ لیکن چیزے بر نہ خواست! حضرۃ امیرِ شریعت مدظلہٗ مردانہ بیٹھک میں میرے پاس ہی دوپہر کی استراحت کے لئے پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ میری مصروفیت اور انہماک دیکھکر فرمانے لگے،

" چھوڑ دو بھائی حافظ جی! اب بس کرو، پھر لکھ لینا، دوپہر کا وقت ہے۔ آرام کرو۔ شام کو تمہیں تراویح میں کھڑے بھی ہونا ہے۔ اس طرح تھک جاؤ گے "۔

میں نے عرض کیا۔

"اباجی! ایک شعر نہیں ہو رہا ہے، آپ اسے مکمل کر دیں۔ میں تو ابھی تک ہارا ہوا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا"۔

تو فرمانے لگے۔

" بھائی میں کیا لکھوں گا، روزہ ہے اپنے حواس ٹھیک نہیں ہیں۔ اسوقت شعر لکھوں کہ آرام کروں"

میں نے اصرار کیا تو فرمانے لگے۔

" اچھا اپنا مصرع سناؤ، سوچونگا، شاید کچھ ہو جائے "۔

تو میں نے یہ مصرع پڑھا کہ

" ایں دیدۂ احمر ہم، وایں چہرۂ اصفر ہم"

سُنکر خاموش ہو گئے، پہلے چت لیٹے ہوئے چھت کیطرف دیکھتے رہے، پھر دائیں طرف کروٹ بدل لی۔ میں منتظر بیٹھا رہا۔ کہ اتنے میں ڈیڑھ دو منٹ کے سکوت و سکون کے بعد فرمانے لگے۔

" — لو بھئی مصرع ہو گیا، اور لاجواب ہوا ہے، لکھو۔

' ہاں لالہ ز غم خوں شد واز ہجر سمن زرد است "

پھر فرمایا۔

" لالہ یوں بھی سُرخ ہوتا ہے، اور چنبیلی یوں زردی ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات کہ وہ غم سے خون میں نہا گیا، اور یہ اثر فراق سے زرد ہو گئی نئی بات ہے۔ اب تمہارے مصرع کے مطابق ہو جائیگا کہ جیسے لالہ غم سے خون ہو چکا ہے، آنکھ بھی اسی طرح خون رونے کی وجہ سے سرخ ہے۔ اور جیسے

چنبیلی زرد ہوتی ہے۔ ویسے ہی رخ عاشق بھی ہجر و فراق کے اثر سے زرد ہو گیا ہے "۔
میں پھڑک اٹھا۔ فرطِ مسرۃ اور وفورِ شوق میں جلد جلد یہ دوسرا مصرع لکھکر شعر کی تکمیل کر لی اور مطمئن ہو بیٹھا لیکن چند منٹ کے مزید وقفہ کے بعد پھر دیکھتا ہوں کہ حضرۃ مدظلہٗ کا چہرہ تفکر میں ڈوبا ہوا ہے، چنانچہ اچانک دوبارہ متوجہ ہوئے اور متبسم ہو کر فرمانے لگے ۔

" لو بھئی اب تم نے چھیڑا ہے تو ہمیں بھی کچھ خیال آگیا، ایک شعر اور ہو گیا ہے ۔ تمہارے " دردے بجگر دارم " پر مجھے خیال آیا کہ " درد " ہو تو " بیمار " خود بخود اس کے علاج کی فکر کرتا ہے لیکن میں نے یہ بتایا ہے کہ نبی علیہ السلام کا " بیمار محبتہ " بھی نرالا ہے کہ وہ " دردِ غم " کا مریض تو ہے، لیکن درد کے مداوی اور زخم کے لئے " مرہم " کی تلاش سے بالکل بے نیاز ہے۔ اور بات بھی ٹھیک ہے ۔ جسے انکی محبتہ کا درد نصیب ہو جائے، اسے اور کسی درماں کی ضرورۃ ہی کیا ہے ۔ ان کی محبتہ کا درد خود ہی اپنا درماں بھی ہے "۔

اور پھر یہ شعر پڑھا کہ ؎ " دردے بجگر دارد، بیمار غمت زینساں؟
خواہد نہ مداوائے، جوید نہ کہے مرہم ! "

● حقیقۃ یہ ہے کہ ان دو شعروں نے نعتہ میں جان ڈال دی، میں نے بھی جھوم جھوم کر انہیں پڑھا اور حضرۃ خود بھی دیر تک اس کے تکرار سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ اور کئی بار فرمایا کہ ۔
" شعر اچھا ہو گیا ہے اور خصوصاً اس " مرہم " نے اور قوافی کیطرح دو الگ الگ الفاظ کے بجائے یکجا قافیہ کا کام بھی دیا ہے، اور " ہم " کے ساتھ آواز میں بھی مشابہ ہے (اگرچہ ہم والے معنی نہیں۔ کہ وہ حرف عطف کا کام دے رہا ہے، جسکے معنی " بھی " ہیں ۔) "

— الغرض اس قابلِ رشک " مشاعرہ مخلوۃ " اور " مشترکہ شاعری " کی صورۃ میں میں نے اپنی نعتہ کی تکمیل کے بہانے یہ دو گرانقدر فارسی شعر بھی حاصل کئے ۔ اور اپنے کلام کی زینتہ بھی بڑھائی ۔

— میں بغرض ثواب و تبرک اپنی نعتہ بھی قارئین کی خدمت میں پیش کئے دیتا ہوں ۔ جسکا عنوان ہے :—

... ...

ارمغانِ محقر

دردے بجگر دارم، داغے بدل اندر ہم — افسانۂ از عشقت، واز ہجر تو دفتر ہم

از داغِ غمِ عشقت، صد خلد بآغوشم — واز خونِ دلِ بسمل صد زمزم و کوثر ہم

من نقشِ خطت دیدم من عکسِ رخت دیدم — در باغ و گلستانہا، در بادہ و ساغر ہم

در کسبِ ضیا بینم، مہر و مہ و انجم را — از غرّۂ ناصیات، واز روئے منور ہم

تنہا نہ من بیخود از حسنِ تو مسحورم — صد حور و ملک گشتہ، دیوانہ و مضطر ہم

صلصل بچنار آمد، طوطی بنگو الکن شد — بلبل ز سر مدحت، دیدیم نوا گر ہم

در رقص بکہساراں طاؤس و تذرواں بیں — در وجد بگلزاراں، شمشاد و صنوبر ہم

"ہاں لالہ ز غم خوں شد، واز ہجر سمن زرد است" — "ایں دیدۂ احمر ہم، وایں چہرۂ اصفر ہم"

ہم بندۂ درگاہت، فغفور و جم و کسرے — ہم چاکر دربارت، دارا و سکندر ہم

ہم مجمعِ انوارت عرفات و منیٰ آمد — شد مظہرِ آثارت فاران و محشر ہم

اے آنکہ کمانت را پیکاں ز قدر باشد — واز عزم و توکل شد از بہر تو معجز ہم

"دردے بجگر دارد، بیمار غمت زینساں" — خواہد نہ مداوا، جوید نہ گہے مرہم

ہاں روئے مبیں بنما، از ذروۂ او ادنیٰ — واز قبۂ ما اوحیٰ نگہے کہ مکرر ہم

من آیم و باشانے، نے سازنہ سامانے — جز دیدۂ گریانے آں گشتہ محیر ہم

آوردم و خود خائف، از شوخئ رندانہ
شاید کہ قبول افتد، ایں جنس محقر ہم

---

۲۴ ★

زمانہ اپنی ہر کروٹ میں لاکھوں رنگ بدلتا ہے؟
مگر اسکو بھی حسرت ہے کہ ہو گرگٹ نہیں سکتا!

○

شانِ وُرُود —— اس کے متعلق خود فرمایا ——!

"(ار ربیع الاول ۱۳۶۱ھ، ۲۵ر جنوری ۱۹۴۲ء یوم شنبہ کا واقعہ ہے) گھر پر"حضرۃ"[۲] تشریف لائے ہوئے تھے۔ مولوی انیس[۳] بھی ساتھ ہی تھے۔ کہ صبح کے وقت انور صابری اور شورش بھی آ پہنچے، انکے پاس (روزنامہ) آزاد کا "آزادی نمبر" تھا جس میں ظفر علیخاں صاحب کے دو شعر چھپے ہوئے تھے، انہوں نے مجھے سنائے اور کہا، کہ ظفر علیخان صاحب کہتے ہیں، کہ اگر کوئی شخص ان دو کے علاوہ کوئی اور قافیہ تلاش کر دے تو ہر شعر پر ایک اشرفی انعام دونگا"

● —— اور اس انعامی دعوی کی اصل روداد شورش صاحب کے اپنے الفاظ میں جیسے وہ آزاد کے "آزادی نمبر" میں شائع کر چکے ہیں بالفاظہ درج ذیل ہے۔ لکھتے ہیں: ——

---

[۱] ۔ گلوالی دروازہ امرتسر (مشرقی پنجاب)

[۲] ۔ مخدومنا و مرشدنا حضرۃ شاہ عبد القادر رائے پوری دامت برکاتہم۔

[۳] ۔ مولوی انیس الرحمن صاحب، ابن مجاہد ملت حضرۃ مولانا حبیب الرحمن صاحب لدھیانوی مدظلہٗ

"مروارید"

ظفر علی خان

۲۲ رجنوری (؟) کی دوپہر کو میں اور علامہ انور صابری مولانا ظفر علیخان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور "آزادی نمبر" کے لئے چند شعروں کی درخواست کی۔ مولانا کی بدیہہ گوئی شروع ہی سے دو باتوں پر منحصر ہے۔ اوّل دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے ساتھ کی انگلی پر دائرہ بناتے جاتے ہیں۔ دوم حقے کا کش لگاتے ہیں۔ ۷۳ برس کی عمر نے آپ کے ہاتھوں میں رعشہ پیدا کر دیا ہے اور حقہ ڈاکٹروں کے مشورہ سے چھوڑ دیا ہے۔ مولانا نے معذرت ظاہر کی۔ میں نے اصرار کیا۔ فرمایا "وہ ذوق سخن آرائی اب کہاں؟" علامہ انور صابری نے ایک دو شعر بھی ارتجالاً کہے، میں نے بھی کچھ مصرعے عرض کئے۔ لیکن مولانا کی طبیعت راغب نہ ہوئی۔ دفتر زمیندار سے اٹھ کر اپنے دفتر میں پہنچے، تو حضرۃ مولانا نے ٹیلیفون سے مندرجہ ذیل دو شعر لکھوائے اور کہا ارتجالاً ہو گئے ہیں؛ ان دو قوافی کے علاوہ کوئی اور قافیہ تلاش کر کے لکھو۔ تو ہر شعر پر ایک اشرفی انعام دونگا۔ میں نے بھی سوچا۔ علامہ انوری صابری نے بھی غور کیا۔ احسان دانش سے پوچھا۔ اور بہت سے مقتدر شاعروں کو پیش کش کی۔ لیکن سب نے قلم کے عجز کا اعتراف کیا۔ مرتضیٰ احمد[1] نے درست کہا تھا ؎

ہر آں کہ تیغ بگیرد نمی شود غازی؟ ہر آنکہ شعر بگوید ظفر علیخان نیست

(شورش کاشمیری)

—(شعر یہ ہیں)—

یہ کہہ دو کشورِ ہندوستاں کے بت پرستوں سے
کہ نقشِ دینِ قیّم تا قیامت مٹ نہیں سکتا!
مسلمان طبلِ آزادی کے بجتے ہی دکھا دیگا
کہ اسلامی سیاست کا یہ چہرہ پٹ نہیں سکتا!

(حضرۃ امیرِ شریعۃ فرماتے ہیں) میں نے تھوڑی دیر غور کیا اور وہیں یہ شعر لکھ کر انہیں سنا دیئے۔ کہ ؎

---

[1] ۔ آقائے مرتضیٰ احمد خان میکش درّانی حال مدیرِ "نوائے پاکستان" لاہور

زمانہ اپنی ہر کروٹ میں لاکھوں رنگ بدلتا ہے!
مگر اس کو بھی حسرت ہے کہ ہو گِرگِٹ نہیں سکتا

اور کہا کہ اب اشرفی انعام میں لاؤ تب جانوں۔
اس پر صابری نے اعتراض کیا کہ گِرگِٹ بالفتح سنا ہے اور زبر ہی کے ساتھ بولا جاتا ہے، تو میں نے جواب دیا کہ میں خود اہلِ زبان ہوں۔ اور میری زبان تم سے زیادہ مستند ہے میں بہار میں پیدا ہی اس گھرانے میں ہوا۔ جہاں شاد عظیم آبادی مرحوم جیسے لوگ خود آکر محاورات اور الفاظ پوچھا کرتے تھے۔ میں نے بچپن سے لے کر اس عمر تک گِرگِٹ زیر کے ساتھ ہی سنا اور اسی طرح بولا ہے۔ گَرگَٹ زبر کے ساتھ یوں بھی تلفظ میں ثقیل اور لغو معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال شعر پر انہوں نے بہت داد دی پھر میں نے انہیں بتایا کہ یہ شعر جہاں محاورہ کے مطابق ہے، وہیں خود ظفر علی خان صاحب کی زندگی پر بھی سیاسی اعتبار سے بالکل صحیح چسپاں ہوتا ہے۔ کہ جیسے گرگٹ کئی رنگ بدلتا ہے۔ کبھی لال، کبھی اودا، کبھی نیلا، کبھی پیلا۔ اسی طرح ان کا بھی سیاسی زندگی میں ایک مقام نہیں رہا۔ آج خلافتی ہیں، کل احرار کے حامی۔ پرسوں نیلی پوش، چوتھے کو لیگی (اور حقیقتاً کچھ بھی نہیں) آج کہیں اور کل کہیں۔ چنانچہ بہت مدت ہوئی، یوپی میں ایک آدمی نے ان کے متعلق ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ جسکا نام تھا ــــــ "پولیٹیکل گِرگِٹ"۔ جس میں ظفر علی خان صاحب کی سیاسی قلابازیوں پر تبصرہ کیا گیا تھا بہرکیف جواب دعوے کو میں نے پیش کر دیا۔ اور انعام نہ ملنا تھا نہ ملا، اور نہ دعوے کرنے والے کا ہی مقصد انعام دینا تھا، نہ جواب دینے والے کا، بلکہ محض تفنن اور بس۔

---

۲۵ —————— ★

چہ گویمت ز کمالِ فرنگِ دشمنِ دیں؟
نشاں دہد ز مقامے کہ اہرمن چہ رسد؟
سبو شکستہ و خم خالی و خرابہ تباہ
ز دستِ ساقیِ تشنہ بہ انجمن چہ رسد؟
بہ ذرّہ ذرّہ سجودے نصیب باشد است
بگو ندیمؔ! کہ اکنوں بہ برہمن چہ رسد؟

○

شانِ وُرُود —— اس کے متعلق خود فرمایا —!

● — تقسیم ملک کے گیارہ ماہ بعد اغلباً شعبان ۱۳۶۷ھ - جولائی ۱۹۴۸ء کے اواخر کا واقعہ ہے — قیام خانگڑھ (ضلع مظفر گڑھ) کے دوران ایک روز عصر کے وقت مردانہ بیٹھک میں مجلس جمی ہوئی تھی۔ راقم الشکور اور احرار کے جوانمرگ ادیب و مفکر برادرِ عزیز آغا منور غوری مرحوم (جالندھری) اور ضلع کے

دو ایک جماعتی کارکن اور دوست بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ حضرۃ امیر شریعۃ مدظلہٗ نے گذشتہ سرما میں اپنی علالۃ اور اسی دوران میں ملکی، قومی اور دینی احوال پر اپنے خیالات و تأثرات بیان فرمانے شروع کئے۔ دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ آخر میں فرمایا ـــــ

" ـــ ملک بانٹ کر انگریز نے تحریکِ آزادیٔ ہند کو جس طرح ختم کیا ہے۔ اس سے فی الحقیقۃ کوئی تغیّر واقع نہیں ہوا۔ کیونکہ اسے آج نہیں کل جانا تو تھا ہی، اس نے سوچا، لاؤ اپنی دو صد سالہ روحانی اولاد کو ہی وارث بنا دوں، کہ پھر آنا پڑے تو لڑائی جھگڑا نہ ہو۔ اور اب بھی وہ گیا کہاں ہے؟ یہیں اندر موجود ہے۔ اور پردے کے پیچھے بیٹھا تار ہلا رہا ہے۔ اور کچھ دنوں تک خوب کھل کھیلے گا۔ اسلئے اسلامی حکومت کے قیام کا تصوّر، کہ جسکے نام پر خدا اور رسول اور ملک و قوم کو دھوکا دیا گیا ہے۔ اپنے آپ کو فریب دینے کے سوا اور کچھ نہیں؟ ابھی بہت سا کام باقی ہے۔ ایک اور دھکے کی ضرورۃ ہے۔ تب شاید اطمینان کی کوئی صورۃ پیدا ہو۔ اور جب تک یہ نہیں ہوتا ہمارے لئے دونوں حالتیں برابر ہیں۔ بلکہ یہ انگریز کی حکومت سے بدتر ہے ـــ کم از کم وہ کفر خالص تو تھا۔ اور اب ـــ نام ـــ اسلام کا ہے ـــ کام ـــ انگریز کا ـــ؟

یوں تو میں اکثر سوچتا ہی رہتا ہوں، اور تنہائی میں تو اور کام بھی کوئی نہیں ہوتا۔ لیکن اس بیماری میں (یعنی محرم ۱۳۶۷ھ۔ دسمبر ۱۹۴۷ء کی علالۃ میں) تو بہت کچھ سوچا۔ ایک دن لیٹے لیٹے مولانا گرامی مرحوم یاد آگئے۔ انکی ایک غزل کے دو تین شعر مجھے بہت پسند ہیں۔ بار بار انہیں دہراتا رہا۔ گرامی کہتے ہیں ؎

زرشکِ جلوہ، بہ آئینہ ہم نیرزد؟ ❖ بخویشتن نہ رسد، آں صنم بمن چہ رسد؟
از خارجی مطلب عشقِ اہلبیت رسول ❖ کہ نارسیدہ بیک تن بہ پنجتن چہ رسد؟

ان دنوں اتفاق سے دیوانِ گرامی (فارسی) میرے سرہانے رکھا رہتا تھا۔ یہ شعر پڑھتے ہوئے ملکی معاملات کیطرف میرا دھیان چلا گیا۔ تو ضعف کے باوجود یونہی بستر پر لیٹے لیٹے، اسی زمین میں یہ تین شعر لکھ دیئے جنمیں مسلم لیگ۔ اسکے لیڈر۔ انگریز ـــ اور ہمارا یہ ملک ـــ ان سبکی اصل پوزیشن آگئی ہے"

۲۶ ——————— ★

نعرہ از پاکئ داماں می زنم
دست بر پیمانہ پنہاں می زنم

○

شانِ ورود ——— اس کے متعلق خود فرمایا ———!

• (محرم ۱۳۶۷ھ - دسمبر ۱۹۴۷ء ہی کا واقعہ ہے) بیماری کے دنوں میں اس فریب خوردہ مخلوق یعنی حضرتِ انسان کی دو رخی اور دو عملی اور پھر اس پر ادعائے خودسری کا خیال آگیا۔ کہ اکثر جو کہا جاتا ہے۔ وہ کیا نہیں جاتا! لیکن اس کے باوجود ندامت نہیں ہوتی۔ بلکہ جو رح، تکبر میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسی مضمون کو میں نے غالب (مرحوم) کی زمین میں ادا کیا ہے، وہ کہتا ہے ؎

زمزمہ بر تارِ رگِ جاں می زنم
تا چہ پنداری کہ دستاں می زنم

شاید پوری غزل ہی ہو جاتی۔ لیکن فرصت کہاں تھی۔ ایک بیماری پھر گھر اور باہر کے کام کاج۔ بس یہی ایک مصرع ہوا۔ اور کچھ نہیں"!

۲۷ ——————— ★

آستینم برُخ و داغ بداماں رفتم!
بچہ طور آمدہ بودم، بچہ عنواں رفتم؟

○

شانِ ورود ——— اس کے متعلق خود فرمایا ———!

"(محرم ۱۳۶۷ھ — دسمبر ۱۹۴۷ء کے دوران) بیماری کے دنوں میں ہی یہ شعر ہوا۔ کچھ اور مصرعے بھی لکھے تھے۔ لیکن پوری غزل یہاں بھی نہ ہو سکی۔ عرفی (مرحوم) کا قصیدہ میرے خیال میں تھا۔ اس پر یہ شعر لکھا — اس نے کہا ہے —!

از درِ دوست چہ گویم بچہ عنواں رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم، ہمہ حرماں رفتم —!"

۲۸ ★

میری تقدیر جو بگڑی تھی بنادی ساقی
دھوم مچادی ساقی

○

شانِ ورود —— اس کے متعلق خود فرمایا ——

" انہیں دنوں میں کہیں یہ نا تمام سا شعر بھی ہو گیا تھا ، اب یہ معلوم نہیں کس خیال سے یہ ردیف اور یہ مضمون باندھا تھا ۔"

۲۹ ——— ★

تم کیا سمجھو، تم کیا جانو؟
تم کیا جانو اے نادانو؟

سیدھی سادی بات نہ سمجھو
گھاتی کی تم گھات نہ سمجھو
گھات نہ جانو گھات نہ سمجھو
دن نہ دیکھو رات نہ سمجھو

تم کیا جانو، اے نادانو؟
تم کیا سمجھو، تم کیا جانو؟

برق نہ جانو، بھاپ نہ سمجھو
باپ کو بھی تم، باپ نہ سمجھو
اپنے کو تم، آپ نہ سمجھو
پُن نہ سمجھو، پاپ نہ سمجھو

تم کیا سمجھو، تم کیا جانو؟
تم کیا جانو، اے نادانو؟

دن کو پوچھو، رات کو پوچھو
رنگ برنگی دھات کو پوچھو
مٹی، پتھر، پات کو پوچھو
ایک نہ پوچھو، سات کو پوچھو

تم کیا جانو، اے نادانو؟
تم کیا سمجھو، تم کیا جانو؟

کچھ تم میں ہیں اصنام پرست
کچھ تم میں ہیں اوہام پرست
کچھ پختہ پرست اور خام پرست
کچھ خمار پرست اور جام پرست

تم کیا سمجھو، تم کیا جانو؟
تم کیا جانو، اے نادانو؟

پوجا ہی تمہارا شیوہ ہے
من بھاتا پیارا میوہ ہے

جب دوڑ تمہاری اتنی ہو!
تم کیا سمجھو، تم کیا جانو!

تم کیا جانو، اے نادانو!
تم کیا سمجھو، تم کیا جانو!

آدم کی بنوّۃ تم کیا جانو؟
حرفِ نبوّۃ تم کیا جانو؟
لفظ اخوّۃ تم کیا جانو؟
احسان و مروّۃ تم کیا جانو؟

تم کیا سمجھو، تم کیا جانو؟
تم کیا جانو، اے نادانو؟

تم ذات صفات کو کیا جانو؟
لات منات کے جاننے والو؟
تم کیا جانو اے نادانو؟ تم کیا سمجھو تم کیا جانو؟

شانِ ورود ——— اس کے متعلق خود فرمایا ———!

● ——" کل پاکستان دفاع، احرار کانفرنس" لاہور منعقدہ ۱۱، ۱۲، ۱۳ ربیع الاول سنہ ۱۳ھ ——
۱۲، ۱۳ اور ۱۴ جنوری سنہ ۱۹۴۹ء بروز جمعہ، ہفتہ، اتوار کے اختتام کے بعد دوسرے روز حضرۃ امیر شریعۃ مدظلہ، محترم تاج الدین انصاری سابق صدر مرکزیہ اور راقم السطور دفتر مرکزیہ مجلس احرار اسلام پاکستان (بیرون دہلی دروازہ لاہور) میں چاشت کے وقت بیٹھے ہوئے کانفرنس کے کوائف عوام اور حکومت کے تاثرات پر مذاکرہ کر رہے تھے کہ اتنے میں سیالکوٹ سے ایک دو دوست آ گئے، وہ عام ملاقات اور خاص اجتماع کے لئے پہلے سے ہی پروگرام بنوانے کے لئے کوشاں تھے۔ اب چونکہ فرصت دیکھی تو مُصر ہو گئے۔ محترم صدر مرکزیہ نے بھی ان کی سفارش کی۔ تو حضرۃ مدظلہ روانگی پر آمادہ ہو گئے۔ اسی اثنا میں آپ نے گفتگو چھوڑ کر سامان طیار کرنا شروع کیا تو بیگ و بکس میں منتشر شدہ کاغذات بھی سمیٹنے لگے۔ میں نے غور سے دیکھا تو ایک خستہ سے ٹکڑے پر ذرہ ذرہ فاصلے پر کچھ اشعار لکھے ہوئے نظر آئے۔ جلدی سے اٹھا کر دیکھا تو مذکورہ نظم کے چار پانچ بند غیر مرتب طور پر لکھے ہوئے تھے۔ کاغذ میرے ہاتھ میں دیکھا تو واپس لیتے ہوئے فرمانے لگے:

"ابھی یہ نظم مکمل نہیں ہے۔ جلدی میں ملتان سے چلا تو کچھ اشعار ہو گئے، پھر سردی کا سفر تھا، مگر

اس کے باوجود میں نے گاڑی میں ہی کچھ نہ کچھ لکھ لیا۔
دیکھو اب سیالکوٹ جا رہا ہوں اور لاری کا سفر ہے۔ امید
ہے۔ پہلے کی طرح اگر سیٹ اچھی مل گئی اور موسم خوشگوار
ہوا۔ تو پھر طبیعت بھی آمادہ ہو جائے گی۔"

چنانچہ دو تین روز کے بعد جب واپسی ہوئی تو یہ نظم تقریباً مکمل تھی۔ دو ایک مصرعے باقی تھے سو وہ لگا لیے گئے اس نظم میں بھی حضرت مدظلہ نے جماعتی پروگرام کے مطابق فتنۂ مرزائیت سے عوام کو آگاہ کرنے کے سلسلہ میں، اشارات کئے ہیں۔ پھر دفاع کانفرنس کے آخری اجلاس میں تنبیہی قسم کا خطاب کر کے حکومت کو بالخصوص اور اہل ملک کو عموماً جن خطرات سے محفوظ رہنے کی تلقین کی گئی تھی۔ اسکا تاثر بھی اشعار میں شامل ہو گیا ہے بہرکیف بس ہلکی پھلکی اور متحرک قسم کی بحر میں اور ترقی پسندانہ انداز کے ساتھ نہایت شیریں لطیف اور مؤثر اشعار موزوں ہو گئے ہیں جن میں استادانہ دسترس اور فنکارانہ چابکدستی کا مظاہرہ قابل دید و ستائش ہے

تبرائیو! اب تبری کرو — گیا وقت قرآن خوانی گیا!
کرو گو بگو یا علی یا علی — کہ اب کرا اوّل و ثانی گیا!
کرامۃ علی کا ہے راجا غضنفر — محمد علی انجہانی گیا!

تہ صدیق اکبر و فاروق اعظم رضی اللہ عنہم

⭘

شانِ ورود ——— اس کے متعلق خود فرمایا ———:

● ——(اغلباً جمادی الاولیٰ ۱۳۶۸ھ۔ مارچ ۱۹۴۹ء کے وسط کا واقعہ ہے) ایک روز کسی دیہاتی دوست نے حضرۃ امیر شریعۃ مدظلہٗ کو اپنے علاقہ میں روافض کی تبلیغ و اشاعۃ کے واقعات سنا کر بڑی پریشانی کا اظہار کیا تو فرمایا:

"یہ بات اب سوچ رہے ہو؟ یہ تو جب پاکستان بنا اسی وقت ہم سمجھ گئے تھے کہ اب حکومۃ دو گروہوں کے قبضہ میں ہوگی۔ شیعہ اور مرزائی۔ شیعہ زیادہ ہیں اور مرزائی کم۔ مگر خطرہ انہی سے زیادہ ہے۔ باقی یہ خیال اب دل سے نکال دو کہ شیعہ کسی بھی گوشہ میں تمہاری رعایۃ یا مدد کرینگے وہ صرف اپنے ہیں اور کسی کے نہیں۔ صوبوں سے لیکر مرکز تک وہی قابض ہیں۔ یہاں کرامۃ علی اور غضنفر علی ہیں تو اوپر خود بانیٔ پاکستان محمد علی تھے۔ اگرچہ وہ سیاسی لیڈر تھے تاہم اپنے مذہب کے وہ بھی بالکل پکے اسمٰعیلی شیعہ تھے۔ باقی رہا اسلام اور قرآن تو سمجھ لو کہ اب جہاں تک انگلش ہے وہ انکو فیل کر کے رہینگے تمہیں تو معلوم نہیں پچھلے سال اسی غضنفر نے راولپنڈی میں خاص طور پر میرا نام لیکر یہاں تک کہا ہے کہ اب وہ زمانہ لد گیا جب بخاری قرآن سنا سنا کر اور مثنوی گا گا کر لوگوں کو الّو بنایا کرتا تھا۔ اب پاکستان بن گیا ہے اور یہاں ان چیزوں کی اب کوئی گنجائش نہیں"۔ تو اب دین کا انجام خود سمجھ لو کیا ہوگا؟"

——— اس گفتگو کے تاثر میں ہی ایک روز انہوں نے صبح کو یہ اشعار لکھ ڈالے۔

۳۱ ★

زلفیں ہوں گی شانے ہونگے
کہیں کہیں افسانے ہونگے
دین اور مذہب کے مرقد پر
شمعیں اور پروانے ہونگے

○

شانِ ورود

اس کے متعلق خود فرمایا ــــــ

● ــ انہیں دنوں کی بات ہے۔ پنجاب اسمبلی کی کاروائی اخبارات میں مسلسل شائع ہو رہی تھی۔ ایک روز یہ قصہ ہوا کہ اسمبلی میں مولانا آزاد مدظلہ کی کتاب تذکرہ کو پنجاب یونیورسٹی کے "ایم۔ اے" کے کورس میں داخل نصاب کر دینے پر بحث ہو گئی۔ اس پر شیعہ نمائندہ شیخ کرامت علی آنجہانی نے بڑے غیظ و غضب سے اٹھ کر کہا۔ کہ:

"ہم پاکستان میں دوسرا دیوبند نہیں بننے دینگے۔ جہاں سے حسین احمد مدنی اور ابو الکلام جیسے غدار پیدا ہوں (اور آفرین ہے اس تاریخی انکشاف پر؟) ایسی کتابیں باغی ذہن پیدا کرتی ہیں۔ ہمیں ان کی اشاعت بھی ممنوع کر دینی چاہئے نہ یہ کہ انکو کورس میں پڑھایا جائے۔ تذکرہ میں چڑے چڑیا کی کہانیوں کے سوائی اور کیا رکھا ہے" (سبحان اللہ! کیا معلومات ہیں؟) یہ کاروائی میں نے پڑھ کر حضرۃ امیر شریعۃ مدظلہ کو سنائی تو دیر تک خاموش رہ کر فرمایا ــــ

"حافظ جی! بس اللہ ہی حافظ ہے دین کا یہاں انگریز کی لولاد اس پر ٹھکے خدا اور رسول کی دشمن ہے۔ شاید کچھ مدۃ بعد یہاں اسلام کا لفظ بھی لوگوں کی سمجھ میں نہ آسکے۔ آثار یہی ہیں۔ واللہ اعلم!" ــ اور اسکے بعد اغلباً دوسرے دن صبح ہی کے وقت یہ دو شعر لکھے!

۳۲ ★

اے جوشؔ کہ تو ہے خاندانی ۔۔۔ ورثہ میں تیرے زباندانی
اُردو ہے تیرے گھر کی لونڈی ۔۔۔ فارسی تجھے ہے تیرا پانی
دہلی کی بھی کی ہے کوچہ گردی ۔۔۔ لکھنؤ کی بھی خاک تو نے چھانی
اک ہُو نہ سمجھ سکا تو افسوس ۔۔۔ اور لڑنے کی بس خدا سے ٹھانی
اک ہُو میں ہیں جلال کبریائی ۔۔۔ اک ہُو میں ہیں کمال مہربانی
اک ہُو میں ہے نفرت و حقارت ۔۔۔ اک ہُو ہے عذاب کی نشانی
اک ہُو کہ ہے رضا و تسلیم ۔۔۔ یعنی کہ جو تو نے میں نے مانی
اک ہُو کہ ہے امتحانِ شبیرؑ ۔۔۔ لب دریا بھی نہ پئے وہ پانی

ف۔ جوشؔ ملیح آبادی

ع۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ

شانِ ورود ـــــ اسکے متعلق خود فرمایا ـــــ

● ـــ اغلباً سنہ ۱۳۶۸ھ سنہ ۱۹۴۹ء کے موسم گرما کا واقعہ ہے مُلتان کے ہفت روزہ جریدہ کارزار (جواب روزنامہ ہے) میں جوشؔ ملیح آبادی (جن کی شاعری سمٹ کر گالی بن چکی ہے) کی حسب دستور ایک ہجویہ اور طنزیہ نظم شائع ہوئی جس میں

خدا (سبحانہ وتعالیٰ شانہٗ) کو جی بھر کر ادبی گالیاں دی گئی تھیں۔ آخری شعر میں یہ مضمون تھا کہ دنیا میں گناہ، ظلم وستم اور دیگر تمام بدیاں اور برائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن (نعوذ باللہ من ذالک) یہ خدا ایسا ہے کہ اس نے ایک "ہوں" بھی جواب میں نہ کہی۔ تاکہ کسی مظلوم کی داد رسی نہ سہی کچھ تسلی ہی ہو جاتی۔ بلکہ یہ خدا چپ چاپ بیٹھا رہا اور ٹس سے مس نہ ہوا۔" میں نے یہ پرچہ حضرۃ امیر شریعت مدظلہٗ کی خدمت میں پیش کیا۔ بلکہ نظم خود پڑھ کر سنائی تو فرمانے لگے :-

"افسوس! وہ اس وقت میرے سامنے نہیں ہے، نہیں تو میں اسے بتاتا کہ جاہل کہیں کے یوں تم تو سلطان القلم اور ملک الشعراء بنا پھرتا ہے اور تیری ساری عمر اسی دنیا میں جھک مارتے گذر گئی ہے۔ لیکن اپنے امر عومہ علم اور دعویٰ زباندانی کے باوجود آج تک تجھے اتنا پتا نہ چلا کہ ہوں اردو کا ایک لفظ ہے اور اس کے صرف یہی معنی نہیں ہیں کہ کسی کے جواب میں ہوں ہاں کہی جائے۔ بلکہ ہوں کے دسیوں معنی ہیں۔ اسے کیا خبر (اور اگر ہے تو پھر نری بے ایمانی ہے کہ جانتے ہوئے بھی وہ سچی بات نہیں کہتا کیونکہ پھر گالیاں دینے کا جواز پیدا نہیں ہو سکتا نا؟) کہ ہوں کبھی غصہ کی نشانی اور قہر وغضب کی علامت بھی ہوتی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ ہوں! یعنی کر لو جو کچھ کرنا ہے۔ تو کیا پھر دنیا میں کبھی ایسی "ہوں" نہیں کہی گئی؟ ایک مرتبہ نہیں سینکڑوں دفعہ کیا قوم نوح، عاد، ثمود، لوط کے واقعات پہلوں میں سے اور بعد میں کبھی تاتاریوں، کبھی عیسائیوں اور یہودیوں کی صورت میں، اور انگریز۔ جو خدا کا سب سے بڑا مجسم عذاب ہے۔ کیا اسکا علم نہیں یہ بھی ہوں تھی۔ اور خدا کی ہوں اکثر یوں ہی ہوا کرتی ہے۔"

● یہ گفتگو چلی تو میں نے عرض کیا اباجی! اس پر تو کچھ ہونا چاہئے۔ اور یہ میرا یقین ہے کہ اُسے آپ سے بہتر جواب کوئی نہیں دے سکتا۔ تو فرمایا "اچھا دیکھا جائیگا۔ میں نے تو یہی ایک بات سمجھائی ہے تاکہ ہوں کا مطلب واضح ہو جائے۔"

● کچھ دنوں بعد خانیوال میں اہل حدیث کانفرنس تھی۔ جس میں شرکت کے لئے حضرۃ کے ایک پرانے ملنے والے مولوی عبداللہ اوڈ فیروزپوری نے ایک بار آکر آمادہ کر لیا تھا۔ وہاں جانا ہوا۔ تقریر ہوئی۔ رات کو وہیں قیام ہوا۔ صبح واپسی پر لاری میں بیٹھ گئے۔ پرانے خانیوال کو لاری نے عبور کیا۔ تو میں نے دیکھا کہ حضرۃ حسب عادۃ کاغذ کے ایک پرزے پر قلم سے کچھ لکھ رہے ہیں۔ میں مسکرایا تو فرمانے لگے۔

"مجھے جوش کی ہوں کھٹک رہی تھی۔ اسی پر چند شعر ہو گئے ہیں۔"

● پھر وہیں مجھے یہ شعر سنائے۔ جو مضمون کے لحاظ سے بلند اور فن کے اعتبار سے لاجواب تھے۔ لیکن ہوا یہ کہ ——— تحریک تحفظ ختم نبوۃ میں ایک سالہ نظربندی سے رہا ہو کر گھر واپس تشریف لائے تو کاغذات سمیٹنے سنبھالنے میں اُسے بھی الگ رکھ لیا۔ مگر سوء اتفاق کہ اشاعت سے تقریباً چار ماہ پہلے اس کا مسودہ ردی کاغذات اور جواب دادہ خطوط کے ہمراہ غلطی سے پھاڑ دیا گیا۔ اب جو میں نے پڑتال شروع کی تو دیکھا نظم غائب ہے۔ سخت افسوس ہوا۔ دو چار دفعہ عرض کیا۔ تو فرمایا :

"بھائی چھوڑو اس قصہ کو میں نے کونسی شاعری کی تھی۔ بس وقتی چیز تھی ختم ہو گئی۔ ضائع ہو گئی تو کیا ہوا؟ آدمی کس کس چیز کا مرثیہ پڑھے۔ یہاں عزۃ وعصمت اور علم برباد ہو گیا۔ تم نظم کو رو رہے ہو۔"

میں نے عرض کیا پھر بھی کوشش کیجئے۔ شاید نعم البدل ہی مہیا ہو جائے۔ چنانچہ معروض قبول ہوا۔ اور ۸ ربیع الآخر ۱۳۷۵ھ یوم شنبہ بعد از مغرب یہ نظم نئے سرے سے پھر لکھی جانے لگی۔ اور صرف ایک رات اور دن میں یہ آٹھ شعر موزوں ہوئے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اشعار پہلی نظم کے ہم پلہ ہیں۔ البتہ نفس جواب اس میں بھی موجود ہے۔

جاتے ہیں کراچی کو!

تدبیر و تراشا ہے — محنت ہی اکارت ہے
بن بن کے بگڑتی ہے — تقدیر کا چکر ہے

آتے ہیں کراچی سے

تدبیر نہیں بنتی! — تقدیر نہیں ٹلتی!
یہ بیل نہیں چڑھتی — ہرگز ہی نہیں پھلتی

جاتے ہیں کراچی کو!

جائیں گے کراچی ہم — پھر زور لگائیں گے
فریاد سنائیں گے — روئینگے رلائیں گے
ان کو بھی بلائیں گے — بیٹھینگے بٹھائیں گے

سب بات بتائیں گے — اور جیت کے آئیں گے

تدبیر لڑائیں گے — تقدیر مٹائیں گے

پھر لوٹ کے آئیں گے — میٹنگ بلائیں گے

اب پارہ بٹھائینگے — سب اپنی ہی آئینگے

تدبیر کے چکر میں — اُن کو بھی پھنسائینگے

○

شانِ ورود ——— اس کے متعلق خود فرمایا ———

● ——— ۱۳۶۷ھ سنہ ۱۹۴۸ء کے وسط سے صوبہ پنجاب کی مسلم لیگی وزارت میں دھڑے بندی شروع ہو گئی تھی جس کی بنیاد و اسباب و محرکات دراصل اس رجعتی جماعت بلکہ بے مقصد بھیڑ کے جذباتی نعروں میں پنہاں تھے۔ ممدوٹ اور دولتانہ دو گروہوں کے لیڈر بنے۔ دونوں میں سے ہر ایک کی کوشش یہ تھی کہ اقتدار بلا شرکت غیرے اسی کیلئے مختص ہو۔ یا جب تک بھی اس کرسی کو رہنا ہے وہی اس پر براجمان رہے۔ تاآنکہ کوئی انقلاب آکر اس اقتدار ہی کا تختہ پلٹ دے۔ اس سلسلہ میں دونوں نے تدبیر پھر گٹھ جوڑ اور بالآخر سازش تک کی۔ بانی پاکستان ابھی زندہ تھے۔ انکے بلاوے پہ کئی دفعہ باری باری کراچی بھی گئے پنجاب میں رہ کر بھی گفتگو، فہمائش، چکمے بازی اور ہر حیلے سے کام لیا گیا۔ لیکن مفاہمت نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔ انہیں دنوں میں حضرۃ امیر شریعۃ مدظلہ نے جو کئی ماہ سے اس تماشائے خود غرضی اور مظاہرہ اقتدار پرستی کا بغور مطالعہ فرما رہے تھے طبع آزمائی شروع کی۔ اور [illegible] کے عنوان سے ایک سیاسی طنز کو نظم کر دیا۔ اور فرمانے لگے۔

" بحمدللہ حافظ جی دنیا میں یہ مسلک بھی ایک نمونہ ہے۔ مگر ہماری قوم سب سے بڑھ کر خود ایک تماشا ہے۔ آخر یہ کیا ہوا کہ بات نہ کبھی خدا نے موقع دیا تو کہوں گا۔ کہ ابھی ابھی مولویوں کے فرسودہ اختلافات پر اعتراضات کرتے ہوئے ان نو تعلیم یافتہ لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ مولویوں نے آج تک کبھی ایسی حرکت نہیں کی۔ جو پڑھے لکھے کر رہے ہیں۔ میں نے ان دونوں بزرگوں کی کاروائیوں کو مختصر اشعار میں لکھا ہے۔" اور پھر یہ نظم سنا دی۔ ———

آئے وہ کراچی سے

کشتی ہی وہ اوندھا دی　　اک بھی نہ بچا لیگی!
نقشہ ہی بدل ڈالا　　تختے ہی الٹ ڈالے
اب گیارھویں والا بھی　　کہتا ہے کنارے پر
مجھ سے بھی نہ ابھرے گا

اے خواجۂ ناظم اسر　　تو نے وہ دیا چکر
چالیس سے ایک اوپر　　چالیس سے دو اوپر
تلپٹ ہی کیا تو نے　　ابلیس کا کل ٹبر
ابلیس کا کل ٹبر　　بھرپور تھا جس ناؤ میں
کشتی ہی کو اوندھایا

اے قائدِ اعظم تم — لیٹے ہو کنارے پر!
کچھ تم کو خبر بھی ہے — کیا گزری ہے بچوں پر؟
کس محنت و کلفت سے — کس پیار سے الفت سے
پالا تھا جنہیں تو نے — خونِ قوم کا دے دے کر

اب کچھ تو مداوا بھی ہو؟

اے قائدِ اعظم جی! — بس تیری دہائی ہے
اک "قائدِ اعظم" تم؟ — اک "قائدِ ملت" یہ؟
لکھا تھا جسے تو نے — خونِ دلِ غربا سے
اس قائدِ ملت نے — لٹیا ہی ڈبو ڈالی
کنبہ ہی ڈبو ڈالا — اُس نام کو دھو ڈالا
برباد کیا سب کو — بدنام کیا سب کو

اور "قائدِ اعظم" تم !
لیٹے ہو کنارے پر !

شانِ ورود ـــــــ اسکے متعلق خود فرمایا ـــــ !

● ـــ بالآخر جب ۲۳ ربیع الاول سنہ ۱۳۶۸ھ ۲۴ جنوری سنہ ۱۹۴۹ء بروز چہارشنبہ وقت کے گورنر جنرل ـ سر ناظم الدین نے الزامات کی ایک طویل فہرست پیش کر کے اپنے خصوصی اختیارات کے ماتحت پنجاب کی وزارۃ کا خاتمہ کر دیا ـ صوبہ لیگ کے دونوں پارلیمانی گروپ کراچی کے سیاسی طواف سے محروم ہو گئے ـ جماعتی میٹنگوں کے ہنگامے سرد پڑ گئے ـ قیاسات اور قیافات نے الٹی صورۃ اختیار کر لی ـ حاضرین کی تعداد اور رائے ہاتھ اٹھانے والوں کی چالبازیوں کا شکار ہو کر رہ گئی تو یہ نظم الٰہی تاثرات پر موزوں کی گئی ـــ حضرۃ امیر شریعۃ مدظلہ نے ریڈیو میں جب اس اعلان کو سنا اور اس پر اخبارات میں تبصرات پڑھے تو فرمانے لگے:

"ـ لو بھئی! بنالو وزارۃ ـ آگیا بنگال کا جادو" عرف "خواجہ ناظم الدین" جن حضرۃ کی برکت سے پچاس لاکھ انسانوں کا وجود صفحہ ہستی سے مٹ گیا اور اسکا کوئی محاسبہ نہ کر سکا تو یہ بیچاری وزارۃ ان کے سامنے کیا حقیقۃ رکھتی ہے ـ اب دیکھو آئندہ کیا ہوتا ہے ـ خدا خیر کرے، کہیں پنجاب بھی دوسرا بنگال ہی نہ بن جائے ـ آخر جناح کے بعد اس بزرگ ہستی کو ملکہ معظمہ کا نمائندہ یعنی پاکستان کا گورنر جنرل نہیں بنایا گیا؟ بس سمجھ لو کہ سب سے زیادہ معتمد اس وقت یہی شخص ہے جو انگریز کی پالیسی کو صحیح طور پر چلا سکے ـ بہرحال اب ہماری خیر نہیں"

●ـ اور عیاں راچہ بیان ـ کہ پھر انکے سہ سالہ دورِ اقتدار میں دین و ملۃ اور ملک کا جو حشر ہوا اسکی خونین داستان کا ایک ایک حرف قیامۃ تک مسلمانوں کے دل و دماغ پر نقش رہیگا ـ اور اس دور کے لگے ہوئے دینی و قومی زخم مزید نمک پاشی سے ابدالآباد تک تر و تازہ رہینگے ـ جنکی کسک سے ملک و ملۃ کا سینہ آہوں اور فریادوں سے معمور ہے ! فَیَا حَسْرَتَا ! عَلٰی مَا فَرَّطُوْا فِیْ جَنْبِ اللّٰہِ ـ

۳۵ —————— ★

آئے وہ کراچی سے!
آئے بھی تو خاک آئے؟

لعنت ہے اس آنے پر

○

شانِ وُرُود —————— اس کے متعلق خود فرمایا —— !

"شاید یہ تیسری نظم بھی ہو جاتی۔ لیکن جب یہ شعر لکھ چکا تو خیال آیا کہ وزارۃ و سیاست کے چکر میں ملت و ملت کا جو حشر ہوا ہے۔ اس پر اس شعر سے زیادہ صحیح اور بلیغ تبصرہ نہیں ہو سکتا۔ آخر اس کشمکش اور اس کے نتائج کو اگر لعنت نہ کہیں تو اور کیا کہیں"؟

ازشاخِ جنوں فتادہ برگیم
مُردیم و در انتظارِ مرگیم
با ایں ہمہ ضُعف و ناتوانی
دانی! کہ چہ کارہا نہ کردیم؟
ما مسلکِ روبہی نہ رفتیم
ما پیرویٔ خرأں نہ کردیم
بر مسندِ فقر یگانہ فردیم

○

شانِ ورود —— اس کے متعلق خود فرمایا ——

● غالباً جمادی الاخری ۱۳۶۹ھ - اپریل ۱۹۵۰ء کا واقعہ ہے، حضرۃ امیرِ شریعۃ مدظلہ' لائل پور اور ضلع جھنگ کے سفر سے گھر واپس تشریف لائے تو فرمایا:

" مکھیانہ میں مولوی محمد اسماعیل (مہتمم مدرسہ ریاض الاسلام) کے ہاں میں بیٹھا ہوا تھا۔ کہ

علامہ علاؤ الدین صدیقی جو لاہور سے جلسہ میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے ، میری ملاقات کے لئے آگئے مصافحہ معانقہ کے بعد پوچھنے لگے : شاہ صاحب ! کیا حال ہے ؟ تو میں نے کہا " علامہ صاحب ! ہم لوگ تو اب مرنے کیلئے جی رہے ہیں۔ کچھ وقت ہم پر سے گذر رہا ہے اور کچھ ہم وقت میں سے گذر رہے ہیں۔ حال تو اپنا آپ سنائیے ! جنہیں ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔ ہم تو آپ کے غدار ٹھہرے۔ ہمارا کیا حال ہوگا۔ ساری عمر فرنگی سے ٹکر لی۔ جوانی جیلوں میں غارت کی، اور جب چار دن خوشی سے بسر کرنے کا وقت آیا تو دنیا بھر کے مفت خورے اور انگریز کے بیٹے قوم پر چڑھ بیٹھے۔ اور جنہوں نے اپنا سب کچھ تباہ کیا تھا وہ غدار بن گئے ؟ ــ بس یہ گفتگو ختم ہوئی تو میں نے فی البدیہہ یہ چند مصرعے کہہ دئے ــ ! اب علامہ صاحب مبہوت ہو کر میرا منہ تک رہے تھے ، پھر کچھ دیر بیٹھے اور چلے گئے "۔

ــ درحقیقت یہ اشعار حضرۃ مدظلہ کے مدۃ العمر کے فقیرانہ استغنار ، مجاہدانہ عزم اور مومنانہ کردار کی پوری عکاسی ہیں ـ جن میں جماعتی مسلک اور انفرادی طرزِ عمل دونوں کو نہایۃ بلاغۃ اور نکتہ رسی سے بیان کیا گیا ہے ۔

چہ جلوہ ایست کہ آسودہ در بر خاک است؟
کہ ذرّہ ذرّہ طرب ریز و بس طربناک است!
چہ فرخیست بجا نہا کہ خاکیاں مستند؟
چہ شورشیست کز و دامن سحر چاک است؟
چہ خندہ ایست کہ از برگ گل ہمی ریزد؟
چہ ساغریست کز و نشّہ در رگ تاک است؟
حضیض خاک بہ بخت بلند می نازد!
کہ در مدیحہ حضیفش حدیث لولاک است!
نگفت خالق مطلق کہ ما خلقت الارض
مقام فکر و تامل حدیث لولاک است!

بیا که با تو سخنها ز حرف لولاک است!

بیا که با تو حکایت ز قدر افلاک است!

مقام و مهبط قرآن و انبیاء گردید!

به مشت خاک بنازم چه رتبهٔ خاک است؟

نسیم مکه محمد که آبروی خدا است!

کسیکه خاک رهش نیست بر سرش خاک است!

هزار لشکر طاغوتیان زند برهم!

قیامتی که بپا از نگاه بیباک است!

گره بطرهٔ مازاغ و ماطغی بستند!

ولی سخن ز سرتاج شاه عرفان است؟

بیا کمال شرافت به نستعلیق بنگر!

نگاه کن چه وفا ها به حرف ایاک است

شانِ ورود ——— اِس کے متعلق خود فرمایا ———!

● ۱۵ ر جمادی الاولیٰ ۱۳۶۹ھ ۵ ر مارچ ۱۹۵۰ء یوم جمعہ کا واقعہ ہے نمازِ عصر کے بعد روزنامہ "امروز" (لاہور) کا "ایران نمبر" جو شاہ ایران کی آمد پر نکالا گیا تھا۔ گھر پہنچ گیا۔ اس میں (غالباً) بہار کے عنوان سے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ایم۔ اے امرتسری کی حسب ذیل فارسی غزل سرورق پر درج تھی۔ ملاحظہ ہو:

بیا چہ جائے شکایت ز جورِ افلاک است — ببیں کہ وقتِ گل است و ہوا طربناک است

ببیں کہ جوششِ بہاراں جنوں نواز آمد! — ببیں کہ دامنِ گل ہا ورق ورق چاک است

بیا کہ بے تو قبائے حیات باشد تنگ — بیا کہ بے تو گریبانِ آرزو چاک است

بیا کہ از تو شکیبا نمی شود خاطر — بیا کہ چشمِ تمنّائے من ہنوز نمناک است

زبس کہ ریزشِ مستی کند سحابِ بہار — نگاہِ نرگسِ شہلا بجوششِ تاک است

فلک بہ ایں ہمہ چشمِ ستارہ ہا نہ بود — حریفِ ذوقِ نگاہے کہ در کفِ خاک است

غرورِ تمکنتِ تاجِ خسرواں شکند — ز نیم غمزہ کہ در یک نگاہِ بیباک است

کرامتِ غمِ ہجرانِ دوست را نازم — کہ سینہ داغِ جحیم است و چشم نمناک است

چہ بادہ ریختہ امشب بجامِ ما ساقی — کہ لذتِ آتشِ زخمارِ سحرگہی پاک است

حدیثِ خلوتیانِ حرم مگو کہ مرا — نظر بجلوہ گہِ شاہدانِ چالاک است

کجاست جلوۂ رنگیں کہ امشب از غیرت — جبینِ شمعِ شبستانِ ما عرقناک است

غزل کے تیور بہت تیکھے تھے۔ پڑھتے ہی حضرۃ امیرِ شریعۃ مدظلہٗ پر وجد سا طاری ہو گیا خصوصاً چھٹے اور ساتویں شعر پر تبسم صاحب کو غائبانہ مرحبا کہتے رہے۔ بہت داد دی۔ بار بار پڑھا۔ پھر فرمایا:-

"بھائی یہ دو شعر تو بہت بلند ہیں۔ ظالم نے کیا بات کہی ہے۔ زمین کو آسمان سے بڑھا لیا ہے۔ مگر ہے بڑے غلط موقع پر۔ یہ نعت ہونی چاہیئے تھی۔ اچھا دیکھو کیا ہوتا ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہم فقیر اس سے بڑھ جائیں گے اور زمین کی فضیلۃ کو دوسری طرح ثابت کریں گے۔"

● خیر اس وقت تو بات آئی گئی ہو گئی، لیکن میں نے دوسرے تیسرے دن دیکھا کہ اکثر اوقات کاغذ پنسل کی طرف متوجہ ہیں۔ ایک دو بار غیبوبۃ میں کاپی اٹھائی تو کچھ مصرعے بھی دکھائی دئیے۔ اب میں خوش تھا کہ چلو اسی بہانے کوئی نئی اور شاندار چیز ہاتھ آئے گی۔ چنانچہ چند روز بعد خود ہی ایک محفل میں مجھے اور چند مہمانوں کو اشعار سنا بھی دئیے۔ بہت خوب تھے۔ اور پھر دل کی گہرائیوں میں مضمر عقیدۃ کے ماتحت ان میں اور بھی خلوص و ارادۃ اور معنویۃ پیدا ہو گئی۔ اسی طرح کچھ دن اور بیت گئے مگر یہ نعت ابھی نامکمل تھی کہ لکھتے لکھتے میں رمضان المبارک آ گیا۔ لیکن گرمی کی شدّۃ روزے کے غلبہ اور ضعف کے سبب مزید اضافہ نہ ہوا۔ بالآخر ——— ۲۶ ر رمضان المبارک ۱۳۶۹ھ ۱۲ ر جولائی ۱۹۵۰ء پنجشنبہ کا دن گزار کر ستائیسویں کی شب کو نماز سے فارغ ہو کر سو گئے،

صحن میں ہی پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ میری بائیں طرف حضرۃ موصوف کا بستر تھا۔ اچانک جو میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ پہلے سے ہی بیدار ہیں اور استادہ گھٹنے پر دوسرا پاؤں رکھے ہوئے ہیں۔ پھر دو منٹ کے توقف کے بعد سرہانے رکھی ہوئی کاپی پنسل اٹھائی اور اندھیرے میں ہی کچھ لکھنا شروع کیا اب میری بھی نیند اچاٹ ہو گئی تو میں نے پوچھا۔ کہ:

ابا جی! کوئی شعر تو نہیں ہوا ——؟ فرمایا:

"ہاں میں تو سویا ہی نہیں۔ نیند کیسی۔ بس اللہ میاں سے معافی مانگنے اور اپنی کالک دھونے میں ہی وقت گزر گیا۔ ویسے میں بہت دیر سے اسی غزل کے پیچھے لگا ہوا ہوں۔ ایک مضمون نہیں بندھ رہا تھا۔ حافظ (شیرازی) صاحب نے اللہ کی رحمت ہو ان پر۔ کیا بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بنفشہ طُرّہ مفتولِ خود گرہ می زد
صبا حکایتِ زلفِ تو درمیاں انداخت

میں دراصل کئی روز سے اس فکر میں تھا کہ ایک طُرّہ اور ایک زلف کی حکایت میں بھی لکھوں۔ سو الحمد للہ ابھی ابھی کامیاب ہوا ہوں۔ اور شعر بھی البلا جواب ہے کہ آج تک اس مضمون کے ساتھ خود میری نظر سے کسی استاد کا کلام نہیں گزرا۔ میں نے معراج لکھدی ہے۔ شعر ہے کہ ؎

گرہ بطرّہ مَا زَاغَ وَمَا طَغٰی بستند!
ولے سخن ز سرتاج مَا عَرَفْنَاکَ است؟

یعنی ایک طرف معراج میں تو یہ عالم ہے کہ جلوۂ ذات کے مشاہدہ میں آنکھ نہیں جھپکی اور دوسری طرف دنیا میں عبادۃ کا یہ حال ہے کہ عجز و حیرۃ اور فناء کُلی کے مقام کو پہنچے ہوئے ہیں۔ اور اعلان ہو رہا ہے۔ کہ ہم نے آپ کو ابھی بھی نہیں پہچانا۔ بھائی سبحان اللہ اور کسی کو شب قدر کی خاص گھڑی چاہے ملی ہو یا نہ ملی ہو۔ ہمیں تو نصیب ہو گئی۔ اور الحمد للہ ایسی ملی کہ کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ آخر حضور علیہ السلام کی نعت اور مدح بھی تو عبادۃ ہے۔ اللہ والے تو نفل اور قرآن پڑھ کر اس گھڑی کو ڈھونڈتے رہے ہوں گے۔ اور مجھ جیسے کم ہمت نے اپنے میاں کا نام لیتے اور انکی تعریف کرتے ہوئے پالیا۔ ہماری یہی شب قدر ہے۔

اللھم صل علے سیدنا و مولانا محمد و علے آل سیدنا و مولانا محمد و بارک و سلم علیھم"

رمضان المبارک رخصت ہوا۔ تو پھر ایک روز فرمانے لگے۔

"معاملہ کچھ ٹھنڈا سا پڑ گیا ہے۔ طبیعت رک گئی ہے۔ ابھی نعت مکمل نہیں ہوئی۔ اب میں اس فکر میں بھی ہوں کہ کسی طرح ایاکَ است۔ کا قافیہ بھی لے آؤں"

اور بالآخر شوال ۶۹ھ کے اوائل اور جولائی ۵۰ء کے اواخر میں یہ قافیہ پابند شعر ہو گیا۔ اغلبا ۲۹ رشوال ۶۹ھ ۱۴ راگست ۵۰ء دوشنبہ کا دن تھا کہ اتفاقاً علاقہ ملتان کے مشہور تعلیمی کارکن اور صاحب ذوق شخص جناب ماسٹر عبد اللہ نیاز صاحب اپنے بچوں کو ساتھ لئے ہوئے مکان پر آ گئے۔ دیر کے بعد ملاقاۃ ہوئی تھی۔ باتیں ہوئیں۔ پرسش احوال و کوائف کے بعد گفتگو کا رخ شعر و سخن کی طرف مڑ گیا۔ حضرۃ مدظلہ نے حسب عادۃ بہت سے عمدہ اشعار سنائے۔ نیاز صاحب نے بھی اپنا انتخاب سنایا۔ کچھ دیر بعد حضرۃ مدظلہ نے فرمایا کہ اب میرا اپنا کلام بھی سنو۔ چنانچہ یہی نعت اپنے مخصوص انداز میں ترنم سے خوب جھوم جھوم کر پڑھی۔ نیاز صاحب ایک ایک مصرع پر داد دیتے، معراج والے شعر پر پھڑک اٹھے اور بے تکلفی میں بے اختیار بولے،

"— ظالم کہاں پہنچے ہو۔ یہ چیز تبسم کی غزل میں بھلا کیسے آ سکتی تھی۔ یہ صرف تمہارا حصہ ہے۔ بخدا تمہیں ضرور شب قدر سے حصہ ملا ہے۔ زمین کی قدر اب سمجھنے کے لائق ہے۔ سچ ہے بھائی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل جو رتبہ زمین کو ملا ہے وہ آسمان کو بھی نصیب نہیں —"

اسکے بعد کہنے لگے :

" اچھا شاہ جی! اب مجھ سے بھی ایک چیز سنئے۔ عرصہ ہوا ایک بند لکھا تھا۔ اور حقیقۃً وہ نظم نہ ہو تو بھی ٹھیک ہے۔ بلکہ میرے لئے تو اسکے دو تین شعر ہی آخرۃ کا بہت بڑا ذخیرہ ہیں۔ سنئے لکھا ہے کہ ؎

اتنا نہ ڈرا تذکرۂ حشر سے اے شیخ؟
عاصی بھی ہوں اور معتقدِ روزِ جزا بھی!
بندوں کی نگاہوں میں وہ دن عید کا ہوگا
جب پردہ اٹھاکر نظر آئے گا خدا بھی
امید نہیں مجھ کو کہ وہ صاحبِ الطاف
پہلی ہی ملاقاۃ میں ہو جائے خفا بھی!

اس پر کافی دیر تک داد و تحسین کا سلسلہ قائم رہا۔ حضرۃ مدظلہٗ تو دیر تک آنسو بہاتے رہے۔ اور آخری شعر کو بار بار پڑھتے رہے۔ اور اس پر یہ مبارک محفل برخاست ہوگئی۔

پھر جب ۵ ر ذوالحجہ ۱۳۶۹ھ ۸ ستمبر ۱۹۵۰ء بروز دوشنبہ کو پشاور احرار کانفرنس سے واپسی پر حضرۃ مدظلہٗ لاہور میں دو روزہ قیام کے لئے ٹھہرے تو تبسم صاحب سے ملاقاۃ ہوئی۔ اس محفل میں سالک بھی موجود تھے۔ حضرۃ تبسم صاحب کو ان کی غزل پر داد دیتے ہوئے اور مضامین کو محفوظ رکھتے ہوئے اپنی نعت سنائی۔ خود فرماتے تھے۔

" جب میں نے یہ شعر پڑھا کہ

بیا کمالِ شرافت بہ لن‌ترانی بنگر؟
نگاہ کن چہ وفا ہا بہ حرفِ ایاکَ است؟

تو اس پر سالک بے اختیار ہوگیا۔ کہنے لگا بھائی ایک تو یہ قافیہ میرے خیال میں نہیں تھا۔ اور پھر جس طرح آپ نے باندھا ہے اس مضمون نے اور بھی غضب ڈھادیا ہے۔ نعت بڑی بلند اور لاجواب ہے۔"

بہرحال اب تقریباً یہ نعت مکمل ہوگئی ہے۔"

تو چہ دانی کہ چہ بر حافظِ دل گیر گزشت
چوں صدی خواست کہ علامہ شبیر گزشت
شارحِ مسلم و ہاں صاحبِ تفسیر گزشت!

شانِ ورود

اس کے متعلق خود فرمایا

● ۲ ربیع الاول ۱۳۶۹ھ — ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء یوم جمعہ — کا واقعہ ہے حضرۃ امیر شریعۃ مدظلہ — مولانا محمد علی جالندھری اور مرزا جانباز امرتسری کی معیۃ میں اغلباً حاصل پور اور کچھ نواحی علاقوں کا دورہ کر کے واپسی پر سستانے کے لئے بہاولپور اتر گئے۔ خود فرمایا کہ :

ابھی گاڑی سے اتر کر پلیٹ فارم پر قدم رکھا ہی تھا۔ کہ جانبازؔ گیٹ کی طرف سے بھاگا اور گھبرایا ہوا آیا۔ اور جلدی جلدی کہنے لگا۔ "شاہ جی! مولانا کا انتقال ہو گیا" میرے اوسان خطا ہو گئے۔ کہ شاید خدانخواستہ مولانا محمد علی کا انتقال ہو گیا میں نے گھبرا کر فوراً کہا کہ کون مولانا؟ تو پھر بولا — مولانا —! یعنی وہ خود اتنا گھبرایا ہوا تھا۔ کہ جلدی میں نام بھی اس کی زبان پر نہ آیا۔ تو میں نے پھر کہا کہ بھائی! آخر کون مولانا؟ کہنے لگا — جی مولانا شبیر احمد عثمانی" — میں نے کہا وہ یہاں کہاں؟ کب آئے۔ تو معلوم ہوا کہ چند روز پیشتر کسی ضروری کام سے آئے تھے۔ اور حسن محمود (سابق وزیر اعلیٰ بہاولپور) کی کوٹھی پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ بس میرے

پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ چاہے ہزار سیاسی اختلافات تھے۔ لیکن بہر حال وہ ہمارے بزرگوں میں سے تھے۔ اور میرے تو اُستاذ بجا۔ بلکہ کئی استادوں کے استاد تھے۔ ان کے مرنے سے علم کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ اور خصوصاً پاکستان میں دیوبندیت کے مسلک کو بڑا دھکا لگا ہے۔ حضرۃ شاہ صاحب (علامہ انور شاہ کاشمیری قدس سرہٗ) کے انتقال پر ہم نے اپنے آپ کو یتیم محسوس کیا تو پھر مولانا تھانوی مرحوم کو دیکھکر تسلی ہو جاتی تھی۔ اور ان کے بعد تو اب صرف مولانا شبیر ہی باقی رہ گئے تھے۔ ! بیٹا! بڑا آدمی رخصت ہوا ہے۔ اللہ رحمت کرے! میرے ساتھ تو جو سلوک وہ کر گئے ہیں اسے کبھی نہیں بھولوں گا۔ ! کہا کرتے تھے۔ "شاہ جی! تم تو سب کے ہو؟"۔ خیر میں اسٹیشن سے قیام گاہ پہنچا اور وہاں سے سیدھا اُن کی جائے وفات پر گیا۔ بہت سے لوگ اکٹھے تھے۔ مولوی بدر عالم دروازے پر ہی مل گئے۔ بیچارے بہت ہی مغموم تھے۔ رو رو کر ان کی آنکھیں پھولی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھا تو پھر چمٹ کر رونے لگے۔ میں نے حوصلہ دیا۔ پھر میں نے منہ دیکھنے کی اجازت مانگی تو بولے۔ "کیوں نہیں۔ آپکا سب سے زیادہ حق ہے۔ آپ سے ان کو بہت تعلق تھا۔ شاہ جی! آپ تو بقول اُنکے سب کے سانجھے ہیں۔ چلیے دیکھیے!" میں گیا اور چادر ہٹائی تو بالکل سوئے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ الحمد للہ ان کا چہرہ با رونق تھا۔ کوئی بری علامت نہیں تھی۔ اور کیوں نہ ہو۔ آخر وہ علامہ شبیر احمد عثمانی، شارح مسلم اور مفسر القرآن اور پھر ہمارے تھے۔ ہمیں اچھی ہی توقع تھی۔ میں نے چہرہ دیکھتے ہی ان کی نعش کو خطاب کیا کہ ——— مولانا! آخر آپ بھی ہمیں اکیلا ہی چھوڑ گئے نا؟ اے کاش آپ جیسے لوگ ہمارے جنازے میں شامل ہوتے۔ بس اس پر ایک کہرام سا مچ گیا۔ بہت گریہ ہوا۔ میں نے وہیں انکی چارپائی کے پاس کھڑے کھڑے فی البدیہہ یہ مصرعے کہہ دیئے، وہ وقت صدمہ کا تھا شعر گوئی مقصود نہ تھی۔ بس اس تاثر میں یہ مصرعے ہو گئے۔ غسل و کفن ہو چکا تھا اسلئے کافور کی خوشبو آ رہی تھی —— وہ مجھے تیر کی طرح لگی۔ ایک تو صدمہ اس پر وہ ٹھنڈی ٹھنڈی بو۔ پھیپھڑوں پر اسی وقت نمونیہ کا حملہ ہو گیا۔ جنازہ پڑھکر میں قیام گاہ پر آیا تو فوراً بخار ہو گیا۔ بس دو دن وہیں پڑا رہا۔ آج بھی بڑی مشکل سے گھر پہنچا ہوں۔ یہ ہے میرا حال!"

● چنانچہ واقعہ یہ ہے۔ کہ جب وقت حضرۃ مدظلہٗ تشریف لائے ہیں حسب عادت گلی میں سے ہی مجھے آواز دی۔ میں کمرے سے نکل کر بھاگا ہوا گیا۔ دروازہ کھولا تو نقشہ ہی دوسرا تھا۔ صدمہ اور دو دن کے مرض سے آدھے معلوم ہوتے تھے۔ کلہاڑی ٹیک کر صحن تک آئے اور ساتھ ہی پھر بات بات پر گریہ شروع ہو گیا۔ والدہ محترمہ نے تسلی دی۔ ہاتھ پاؤں دبائے پھر بھوک سے بھی نقاہت تھی کچھ ناشتہ کیا اور آرام کیلئے لیٹ گئے مگر پھر جلدی اٹھ نہ سکے ملکہ اسی صدمہ و مرض سے مرکب علالت میں ڈیڑھ تین ماہ بستر پر رہکر بہت کمزور ہو گئے اور پھر رفتہ رفتہ تندرست ہو کر حسب سابق تبلیغی مہمات میں معروف ہو گئے

ز کاف کعبہ تا کاف کراچی!
سراسر کفر و کفر دون کفر

شانِ ورود ـــــ اس کے متعلق خود فرمایا ـــــ

ـــ شعبان ۱۳۷۰ھ ـ مئی سنہ ۱۹۵۱ء کا واقعہ ہے دفتر مجلس احرار اسلام کراچی میں احباب اراکین جماعۃ اور دوسرے ملنے والوں کی محفل برپا تھی ـ حضرۃ امیر شریعۃ مدظلہ کے ساتھ مولانا محمد علی جالندھری اور راقم السطور بھی بیٹھے ہوئے تھے کہ ملکی معاملات پر گفتگو شروع ہو گئی ـ خصوصًا اسلامی حکومت کا موضوع زیر بحث تھا ـ تنقید ہو رہی تھی ـ کہ اہل اقتدار نے عوام سے کئے ہوئے وعدے ایفا نہ کئے ـ بلکہ اس کے برخلاف مغربیت ـ امپیریلزم اور لادینی کو مختلف صورتوں اور حیلوں بہانوں سے اسلام ثابت کرنے اور اس کفر و دھریت کے مرکب کو بجبر یہاں نافذ کرنے کی تدابیر بروئے کار لائی جا رہی ہیں ـ ساری گفتگو کے خاتمہ پر حضرۃ موصوف نے اہل مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں فرمایا ـ

"تم ایک پاکستان کو روتے ہو باقی مسلمان ممالک کا کیا حال ہے، سب کے سب ایک دوسرے سے بدتر ہیں کون سی جگہ ہے جہاں ملعون انگریز نے اپنا کام نہیں کیا ہے ـ اس نے مسلمانوں کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے، اور آج تو امریکہ میں بھی ـ یا امریکہ ہے یا برطانیہ بہرحال ملوکیت ہے اسلام وہاں بھی نہیں ـ اسی لئے میں تو بلا خوف کہتا ہوں کہ کعبہ سے لیکر کراچی تک ہر جگہ قانون کفر ہی مسلط ہے ـ کہنے کو سب مسلمان ہیں، مگر ہیں انگریز کے لونڈی اور بچے نذک حرامان محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں ـ کہ جس محسن انسانیت کی جوتیوں کے صدقہ میں ان عیاشیوں کو حکومتیں ملیں عین وقت پر اسی کو فراموش کر بیٹھے ـ" ـــــ اور پھر اپنے جلال آمیز انداز سے یہ شعر پڑھ کر محفل برخاست کر دی میں نے اسی وقت پوچھا ـ ابا جی! جس انداز سے آپ نے الگ الگ مصرعے پڑھے تھے، ابتداءً وہ مسجع کلام محسوس ہوا تھا ـ یہ ابھی ہوا ہے، یا پہلے کسی وقت ـ فرمایا ـــــ "نہیں کئی مہینے پہلے ملتان ہی میں یہ شعر میں نے لکھا تھا ـ"

۴۰

سب سے پہلے حُسن کی رعنائیاں ناپی گئیں!
پھر ہمارے عشق کی پہنائیاں ناپی گئیں!

شانِ وُرُود ـــــ اس کے متعلق خود فرمایا ـــ

● ـــ "تحریکِ تحفظِ ختم نبوۃ" کی قیادت کے ناقابلِ معافی جرم کی پاداش میں تقریباً ایک برس تک جیل بے جا (نظر بندی) کی سزا بھگت کر رہا ہونے کے بعد حضرۃ امیرِ شریعۃ مدظلہٗ گھر پر تشریف لائے تو بقیہ دوستوں میں سے عمِ مکرم قبلہ شیخ حسام الدین صاحب زید لطفہٗ و فضلہٗ کی رہائی کی خبر بھی آ گئی۔ جو انہوں نے خود بذریعہ تار بھجوائی تھی۔ جس میں لاہور پہنچنے کا تقاضا بھی تھا۔ چنانچہ ایک دو روز کے بعد حضرۃ موصوف آمادۂ سفر ہوئے تو راقم السطور بھی ہمراہ ہو گیا۔ ۲۹ رجب سنہ ۱۳۷۳ھ ۴ اپریل سنہ ۱۹۵۴ء یوم جمعہ کو ظہر کے وقت پاکستان میل پر لاہور کیلئے روانہ ہوئے۔ راستے میں جامعہ رشیدیہ منٹگمری کے سالانہ جلسہ میں شرکت کا خیال قوی ہو گیا۔ اگرچہ وعدہ بھی مشروط ہی تھا۔ گاڑی (پاکستان میل) ابھی منٹگمری سے کئی میل دور ہی تھی کہ ایک غیر مقلد دوست نے راقم سے ادبی و شعری سوالات شروع کر دیے۔ اس پر یہ دلچسپ سلسلہ ایک پُرسکون محفل میں تبدیل ہو گیا۔ عربی، فارسی، اردو اور پنجابی کے اشعار سنے سنائے گئے۔ راقم نے ایک غزل نما اخلاقی نظم سنائی۔ جس میں ایک خاص نوعیت سے شدید تأثرات کا اظہار کیا گیا تھا۔ رعنائیاں، پہنائیاں وغیرہ قافیہ تھا۔ حضرۃ مدظلہٗ نے غزل پسند فرمائی۔ بعض اشعار مکرر سنے، پھر یہ محفل گفتگو رکنے کی صورۃ میں برخاست ہو گئی۔ اتنے میں گاڑی منٹگمری سے صرف دس بارہ میل کے فاصلے پر آ گئی۔ تو میں نے دیکھا کہ حضرۃ موصوف اپنی دائیں ہاتھ والی کھڑکی کی طرف رخ کیے ہوئے ہیں۔ قلم ہاتھ میں ہے اور کاغذ کے ایک پُرزے پر کچھ لکھ رہے ہیں۔ میرے دیکھتے ہی آپ نے جو نگاہ اٹھائی تو مجھے تکتے ہوئے دیکھ کر مسکرا اٹھے۔ میں نے اپنی سیٹ سے جو بالکل سامنے تھی گاڑی کے شور کی وجہ سے اونچی آواز میں کہا کہ ابا جی معلوم ہوتا ہے۔ کچھ ہو رہا ہے؟ تو مسکرا کر فرمانے لگے "ہاں۔ ہو گیا!" چنانچہ وہیں یہ شعر سنا دیا۔ ایک شعر اور بھی تھا مگر افسوس کہ وہ مسودہ کا کاغذ کہیں ضائع ہو گیا۔ اور اس طرح ہم ایک اچھے شعر سے محروم ہو گئے۔

اپیل ــــ

نئے نصاب اور نئے طرزِ تعلیم کی علمبردار مثالی درسگاہ ــ!

دیندار عوام • اہل ثروۃ وخیر • داعیانِ اصلاح اور شائقینِ تعلیم کی توجہ کا مستحق ادارہ ــــ

مدرسہ حریۃ اسلامیہ ملتان

قارئین کرام! یہ حقیقۃ ہر انسان پر روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ جب تک کسی چیز کو رواج دینے کے وسائل و ذرائع فراہم نہ کئے جائیں، اس کا قیام و بقا مشکل ہے اور اسی ضابطہ کے ماتحت دینی تعلیم کا اہم و بنیادی مسئلہ بھی ہے جس کی بقا و حفاظت اس کی ترویج و تبلیغ کی محتاج ہے۔ تقسیم ہند کے بعد صورۃ حال یہ ہے کہ ملک میں

کی روحانی اولاد اور دہریت کے پیروکاروں نے مرزائیت، نیچریت، کمیونزم، فسطائیت، پرویزازم، چکڑالویت اور رفض و بدعت کی صورۃ میں کفر و الحاد اور منافقت و زندقیت کی نشر و اشاعت ــــ اور ــ خدا و رسول سے بغاوۃ کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ خود اہل اقتدار شعائر اسلام اور علماء دین کو جبر و تشدد کے ذریعہ مٹانے کے لئے جان کی بازی لگا دی ہے۔ لیکن خود مسلمان مجموعی طور پر توحید، ختم نبوۃ، مقام صحابہ رضی اللہ عنہم جیسے بنیادی عقاید اور اسلامی افکار کی تعلیم و تبلیغ سے قطعاً بے خبر اور اس شیطانی حملہ کے مقابلہ سے بالکل بے نیاز ہوتے جا رہے ہیں۔ دوسری جانب تقسیم کے خونی حادثہ میں ملک و قوم کو عموماً اور اسلام کے تعلیمی و تبلیغی مراکز کو خصوصاً جو ناقابل تصور نقصان پہنچا ہے، علماء کرام اور عوام کی ممکنہ کوشش کے باوجود ابھی تک اس کی تلافی نہیں ہو سکی۔ مزید برآں یہ کہ عصر حاضر کے لحاظ سے جس قسم کے صحیح الفکر اور سلیم المسلک عالم نوجوانوں کی شدید ضرورۃ پیدا ہو رہی ہے۔ اس کیلئے درس نظامی بہت سی انقلابی تبدیلیوں اور اضافوں کا محتاج ہے۔ چنانچہ اس اہم ضرورۃ پر طویل عرصہ تک گہری سوچ بچار کے بعد ملک کے مشہور علمی و ادبی مرکز ــــ

نادیۃ الادب الاسلامی پاکستان (ملتان) نے اہل سنۃ و جماعۃ کے محفوظ و مضبوط مسلک پر قطب الوقت سیدنا حضرۃ شاہ عبدالقادر رائے پوری دامت برکاتہم کے ارشاد کے مطابق اور حضرۃ امیر شریعۃ سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری مدظلہ العالی کے زیر اہتمام ایک جدید بنیاد پر مثالی درسگاہ کے قیام کی تجویز منظور کی۔ اور مورخہ ۱۴ ار ذوالقعدہ ۱۳۷۳ھ